Women Writers
Classics

افسانے

چھوئی موئی

عصمت چغتائی

RHOTAS LPS
Low Priced Series

چڑی کی دکی

افسانے

عصمت چغتائی

روہتاس بکس

اشاعت اول	1992ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز پٹیالہ گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبرز - ٹیمپل روڈ لاہور

چڑی کی دکی

ترتیب

عصمت کا سراپا

سعادت حسن منٹو

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا۔ حیدر آباد سے ایک صاحب کا ڈاک کارڈ موصول ہوا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"یہ کیا بات ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی؟ منٹو اور عصمت، اگر یہ دو ہستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر افسوس کہ عصمت نے شاہد سے شادی کر لی اور منٹو----"

انہی دنوں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی میں اس میں شریک نہیں تھا۔ لیکن حیدر آباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی۔ جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا "آپ نے منٹو سے---- شادی کیوں نہیں کی؟"

مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بات درست ہے یا غلط لیکن جب عصمت چغتائی واپس آئی تو اس نے میری بیوی سے کہا کہ حیدر آباد میں ایک لڑکی نے جب اس سے سوال کیا "کیا منٹو کنوارا ہے؟" تو اس نے ذرا طنز کے ساتھ جواب دیا "جی نہیں" اس پر وہ محترمہ عصمت کے بیان کے مطابق کچھ کھسیانی سی ہو کر خاموش ہو گئیں۔

واقعات کچھ بھی ہوں لیکن یہ بات غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے کہ سارے ہندوستان میں صرف ایک حیدر آباد ہی ایسی جگہ ہے جہاں مرد اور عورتیں میری اور عصمت کی شادی کے متعلق فکرمند رہے ہیں۔

اس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں، اگر میں اور عصمت واقعی میاں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا؟ یہ "اگر" بھی کچھ اسی قسم کی اگر ہے۔ اگر کہا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا اٹھارہواں حصہ بڑی ہوتی تو

اس کا اثر وادیٔ نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا۔ لیکن یہاں عصمت قلوپطرہ ہے اور نہ منٹو انطونی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر عہدِ حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا افسانے افسانے بن جاتے کہانیاں مڑ تڑ کر پہیلیاں ہو جاتیں۔ انشاء کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہو کر یا ایک سفوف کی شکل اختیار کر لیتا یا بھسم ہو کر راکھ بن جاتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آخری تحریر ہوتے لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ قرینِ قیاس تو یہی ہوتا کہ نکاح نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے تاکہ سند رہے۔ نکاح کے دوران میں کچھ اسی باتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

"عصمت، قاضی صاحب کی پیشانی ایسا لگتا ہے تختی ہے۔"

"کیا کہا؟"

"تمہارے کانوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"میرے کانوں کو تو کچھ نہیں ہوا تمہاری آواز حلق سے باہر نہیں نکلتی۔"

"حد ہو گئی۔ لو اب سنو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قاضی صاحب کی پیشانی بالکل تختی سے ملتی جلتی ہے۔"

"تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے۔"

"یہ پیشانی سپاٹ نہیں؟"

"تم سپاٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟"

"جی نہیں۔"

"سپاٹ ماتھا تمہارا ہے۔ قاضی جی کا ماتھا تو۔۔۔۔"

"بڑا خوبصورت ہے۔"

"خوبصورت تو ہے۔"

"تم محض چڑا رہی ہو مجھے۔"

"چڑا تم رہے ہو مجھے۔"

"میں کہتا ہوں تم چڑا رہی ہو مجھے۔"

"میں کہتی ہوں تم چڑا رہے ہو مجھے۔"
"تمہیں ماننا پڑے گا کہ تم چڑا رہی ہو مجھے۔" "اجی واہ! تم تو ابھی سے شوہر بن بیٹھے۔"

"قاضی صاحب' میں اس عورت سے شادی نہیں کروں گا۔ اگر آپ کی بیٹی کا ماتھا بھی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے پڑھوا دیجئے۔"

"قاضی صاحب' میں اس مردود سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر آپ کی چار بیویاں نہیں تو مجھ سے شادی کر لیجئے۔ مجھے آپ کا ماتھا بہت پسند ہے۔"

اگر ہم دونوں کو شادی کا خیال آتا تو دوسروں کو حیرت و اضطراب میں گم کرنے کے بجائے ہم خود اس میں غرق ہو جاتے اور جب ایک دم چونکتے تو یہ حیرت اور اضطراب جہاں تک میں سمجھتا ہوں مسرت کے بجائے ایک بہت بڑے فکاہیہ میں تبدیل ہو جاتا۔ عصمت اور منٹو' نکاح اور شادی' کتنی مضحکہ خیز ہے۔

عصمت لکھتی ہے۔

ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت' کتنے محمود' عباس عسکری یُونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دیئے گئے ہیں کوئی بتاؤ۔ ان میں سے چور پتا کون سا ہے؟ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں' محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضا' عسکری کے بے رحم ہاتھ' یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تِل' عباس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے' کشادہ پیشانیاں' گھنے گھنے بال' سڈول پنڈلیاں' مضبوط بازو' سب ایک ساتھ مل کر کچے سوت کے ڈوروں کی طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا سرا پکڑوں کہ کھنچتا ہی چلا آئے اور میں اس کے سہارے دور افق سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔ (چھوٹی آپا)

منٹو لکھتا ہے۔

میں صرف اتنا سمجھا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور زمینیں خریدنا تمہارے لئے ایک ہی بات ہے سو تم محبت کرنے کے بجائے ایک دو بیگھے زمین خرید

لو اور اس پر ساری عمر قابض رہو۔ زندگی میں صرف ایک عورت اور یہ دنیا اس قدر بھری ہوئی کیوں ہے؟ کیوں اس میں اتنے تماشے جمع ہیں۔ میری سنو اور اس زندگی کو جو کہ تمہیں دی گئی ہے اچھی طرح استعمال کرو۔ تم ایسے گاہک ہو جو عورت حاصل کرنے کے لئے ساری عمر سرمایہ جمع کرتے رہو گے مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔ میں ایسا خریدار ہوں، جو زندگی میں کئی عورتوں سے سودے کرے گا۔ تم ایسا عشق کرنا چاہتے ہو کہ اس کی ناکامی پر کوئی ادنیٰ درجے کا مصنف ایک کتاب لکھے جسے نرائن دت سہگل پیلے کاغذوں پر چھاپے اور ڈبی بازار میں اسے ردی کے بھاؤ بیچے۔ میں اپنی کتاب کے تمام اوراق دیمک بن کر چاٹ جانا چاہتا ہوں تاکہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ تم محبت میں زندگی چاہتے ہو میں زندگی میں محبت چاہتا ہوں۔

(تکلیف)

عصمت کو اگر الجھے ہوئے سوت کے ڈھیر میں سے ایسا سرا مل جاتا، کھینچنے پر جو کھنچتا ہی چلا آتا اور وہ اس کے سہارے دور افق سے اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاتی اور منٹو اگر اپنی کتابِ حیات کے آدھے اوراق بھی دیمک بن کر چاٹنے میں کامیاب ہو جاتا تو آج ادب کی لوح پر ان کے فن کے نقوش اتنے گہرے کبھی نہ ہوتے وہ دور افق سے بھی اوپر ہوا میں تنی رہتی اور منٹو کے پیٹ میں اس کی کتاب حیات کے باقی اوراق بھس کی طرح بھر کے اس کے ہمدرد اسے شیشے کی الماری میں بند کر دیتے۔

"چوٹیں" کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتا ہے۔

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

عصمت کے متعلق جو کچھ میں لکھ رہا ہوں کسی بھی قسم کی خفت مٹانے کا نتیجہ نہیں ایک قرض تھا جو سود کی بہت ہی ہلکی شرح کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں نے عصمت کا کون سا افسانہ پڑھا تھا مجھے بالکل یاد نہیں۔

یہ سطور لکھنے سے پہلے میں نے حافظے کو بہت کھرچا لیکن اس نے میری رہبری نہ کی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عصمت کے افسانے کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ لیکن جب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو مجھے سخت ناامیدی ہوئی۔

اڈلفی چیمبرز کیر روڈ بمبئی کے ۱۷ نمبر فلیٹ میں جہاں "مصور" ہفتہ وار کا دفتر تھا۔ شاہد لطیف اپنی بیوی کے ساتھ داخل ہوا۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ تمام کانگریسی لیڈر مہاتما گاندھی سمیت گرفتار ہو چکے تھے اور شہر میں کافی گڑبڑ تھی۔ فضا سیاسیات میں بسی ہوئی تھی۔ اس لئے کچھ دیر گفتگو کا مضوع تحریک آزادی رہا۔ اس کے بعد رخ بدلا اور افسانوی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک مہینہ پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا ادب لطیف میں عصمت کا "لحاف" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے میں نے کرشن چندر سے کہا تھا افسانہ بہت اچھا ہے لیکن آخری جملہ بہت غیر صناعانہ ہے احمد ندیم قاسمی کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا۔ چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عصمت چغتائی سے کہا۔ "آپ کا افسانہ "لحاف" مجھے بہت پسند آیا۔ بیان میں الفاظ کو بقدر کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار سا جملہ لکھ دیا۔" عصمت نے کہا "کیا عجیب ہے اس جملے میں؟"

"لحاف"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتی شے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ مجھے سخت ناامیدی ہوئی اس لئے کہ میں "لحاف" کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا جب عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی۔"

مجھے یاد ہے اس ملاقات کے دوسرے ہی روز میں نے اپنی بیوی کو دہلی خط لکھا "عصمت سے ملا۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل ایسی ہی عورت ہے جیسی تم ہو۔ میرا مزہ تو بالکل کرکرا ہو گیا لیکن تم اسے یقیناً پسند کرو گی۔ میں نے

جب اس سے "لحاف" کا ذکر کیا تو نالائق اس کا تصور کرتے ہی جھینپ گئی۔"

ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے اس پہلے رد عمل پر سنجیدگی سے غور کیا اور مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ اپنے فن کی بقا کے لئے انسان کو اپنی فطرت کی حدود میں رہنا ازبس لازم ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے، کچھ تو گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علیحدہ ہو گیا اور کچھ پتلون کی جیبوں میں ٹھنس ہو کر رہ گیا۔ فرانس میں جارج ساں نے نسوانیت کا حسین ملبوس اتار کر تصنع کی زندگی اختیار کی۔ پولستانی موسیقار شوپین سے لہو تھکوا تھکوا کر اس نے لعل و گہر ضرور پیدا کرائے لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بطن میں دم گھٹ کر مر گیا۔

میں نے سوچا عورت جنگ کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑنے کا پہاڑ کاٹے افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی مہندی رچنی ہی چاہئے۔ اس کی بانہوں سے چوڑی کی کھنک آنی ہی چاہئے۔ مجھے افسوس ہے جو میں نے اس وقت اپنے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی۔"

عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں بھول بھلیاں، تل، لحاف اور گیندا جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی بھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف، ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ یہ ادائیں وہ عشوے وہ غمزے نہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کئے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں ان روحانی اشاروں کی منزل مقصود انسان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی ان جانی، ان بوجھی مگر مخملیں فطرت لئے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔

"ساقی" میں "دوزخی" چھپا۔ میری بہن نے پڑھا اور مجھے کہا "سعادت! یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے اپنے منے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا۔ کم بخت نے کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں۔"

میں نے کہا "اقبال اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

شاہ جہاں نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے تاج محل بنوایا۔ عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں "دوزخی" لکھا۔ شاہ جہاں نے دوسروں سے پتھر اٹھوائے انہیں ترشوایا اور اپنی محبوبہ کی لاش پر عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ عصمت نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے خواہرانہ جذبات چن چن کر ایک ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پر نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی نعش رکھ دی۔ تاج محل شاہ جہاں کی محبت کا برہنہ مرمریں اشتہار معلوم ہوتا ہے لیکن "دوزخی" عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے۔ وہ جنت جو اس مضمون میں آباد ہے' عنوان اس کا اشتہار نہیں دیتا۔

میری بیوی نے یہ مضمون پڑھا تو عصمت سے کہا "یہ تم نے کیا خرافات لکھی ہے۔"

"بکو نہیں۔ لاؤ وہ برف کہاں ہے؟"

عصمت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے۔ بالکل بچوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لئے دانتوں سے کٹاکٹ کاٹتی رہتی ہے اور اس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا کر لکھے ہیں۔ چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھے لیٹی ہے۔ سامنے تکیے پر کاپی رکھی ہے ایک ہاتھ میں فاونٹین پین ہوے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی' ریڈیو اونچے سروں میں چلا رہا ہے مگر اس کا قلم اور منہ دونوں کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔

عصمت پر لکھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ نہ لکھے تو مہینوں گزر جاتے ہیں پر جب دورہ پڑے تو سینکڑوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے گزر جاتے ہیں۔ کھانے پینے' نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا بس ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی اپنے ٹیڑے میڑھے اعراب اور املا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔

"ٹیڑھی لکیر" جیسا طول طویل ناول میرا خیال ہے عصمت نے سات آٹھ نشستوں میں ختم کیا تھا۔ کرشن چندر عصمت کے بیان کی رفتار کے متعلق لکھتا ہے۔

"افسانوں کے مطالعہ سے ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے گھڑ دوڑ یعنی رفتار' حرکت' سبک خرامی (میرا خیال ہے کہ اس سے کرشن چندر کی مراد

برق رفتاری تھی۔" اور تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے کنائے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔"

عصمت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع کرے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آگے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے۔ یخنی بگھارنے کی خاطر اگر کبھی باورچی خانے چلی جائے گی تو معاملہ بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔ طبیعت میں چونکہ بہت ہی عجلت ہے اس لئے آٹے کا پیڑا بناتے ہی سنکی سنکائی روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آلو ابھی چھیلے نہیں گئے لیکن ان کا سالن اس کے دماغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے۔ اور میرا خیال ہے۔ بعض اوقات وہ باورچی خانے میں قدم رکھ کر خیال خیال میں شکم سیر ہو کر لوٹ آتی ہو گی لیکن اس حد سے بڑھی ہوئی عجلت کے مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی بچی کے فراک سیتے دیکھا ہے۔ اس کا قلم لکھتے وقت املا کی غلطیاں کرتا جاتا ہے۔ لیکن ننھی کے فراک سیتے وقت اس کی سوئی سے ہلکی سی لغزش بھی نہیں ہوتی۔ نپے تلے ٹانکے ہوتے ہیں اور مجال ہے جو کہیں جھول ہو۔

"اف رے بچے" میں عصمت لکھتی ہے۔

"گھر کیا ہے محلے کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے۔ دنیا کے بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے۔ سنتے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں مرتے ہوں گے کیا خبر؟"

اور پچھلے دنوں بمبئی میں جب اس کی بچی سیما کو کالی کھانسی ہوئی تو وہ راتیں جاگتی تھی، ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی، ممتا ماں بننے کے ساتھ ہی کوکھ سے باہر نکلتی ہے۔ عصمت پرلے درجے کی ہٹ دھرم ہے۔ طبیعت میں ضد ہے بالکل بچوں کی سی، زندگی کے کسی نظریئے کو، فطرت کے کسی قانون کو پہلے ہی سابقہ میں کبھی قبول نہیں کرے گی۔ پہلے شادی سے انکار کرتی رہی۔ جب آمادہ ہوئی تو بیوی بننے سے انکار کر دیا۔ بیوی بننے پر جوں توں رضامند ہوئی تو ماں بننے سے منکر ہو گئی۔ تکلیفیں اٹھائے گی۔ صعوبتیں برداشت کرے گی۔ مگر ضد سے کبھی باز نہیں آئے گی۔ میں

سمجھتا ہوں۔ یہ بھی اس کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ زندگی کے حقائق سے دوچار ہو کر بلکہ ٹکرا ٹکرا کران کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی ہربات نرالی ہے۔ عصمت کے زنانہ اور مردانہ کرداروں میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار پایا جاتا ہے۔ محبت میں بری طرح مبتلا ہیں۔ لیکن نفرت کا اظہار کئے چلے جا رہے ہیں۔ جی گال چومنے کو چاہتا ہے لیکن اس میں سوئی کھبو دیں گے۔ ہولے سے تھپکانا ہوتا تو ایسی دھول جمائیں گے کہ دوسرا بلبلا اٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت جو محض ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے عام طور پر عصمت کے افسانوں میں ایک نہایت رحم انگیز صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔

عصمت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور پر ہوا اور میں اسے دیکھنے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہو گا۔

عصمت سے ملتے جلتے مجھے پانچ چھ برس ہو گئے۔ دونوں کی آتش گیر اور بھک سے اڑ جانے والی طبیعت کے پیش نظر احتمال تو اسی بات کا تھا کہ سینکڑوں لڑائیاں ہوتیں مگر تعجب ہے کہ اس دوران میں صرف ایک بار چخ ہوئی اور وہ بھی ہلکی سی۔ شاہد اور عصمت کے مدعو کرنے پر میں اور میری بیوی صفیہ دونوں لاڈ (بمبئی کے مضافات میں ایک جگہ جہاں شاہد بمبئی ٹاکیز کی ملازمت کے دوران میں مقیم تھے) گئے ہوئے تھے رات کا کھانا کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہد نے کہا "منٹو، تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

ڈیڑھ بجے تک میں نے تسلیم نہ کیا کہ میری تحریر میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ شاہد تھک گیا۔ دو بجے تک عصمت نے اپنے شوہر کی پیروی کی میں پھر بھی نہ مانا۔ دفعتاً" کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا میں نے جھٹ سے کہا "صحیح لفظ دراز دستی ہے" تین بج گئے، عصمت نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ میری بیوی سو گئی۔ شاہد قصہ ختم کرنے کے لئے دوسرے کمرے سے لغت اٹھا لایا "د" کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہیں تھا۔ البتہ دراز دستی اور اس کے معنی درج تھے۔ شاہد نے کہا "عصمت! اب تمہیں ماننا پڑے گا" اب میاں بیوی میں چخ شروع ہو گئی۔ مرغ اذانیں دینے لگا۔ عصمت نے لغت اٹھا کر

ایک طرف پھینکی اور کہا "جب میں لغت بناؤں گی تو اس میں صحیح لفظ درست درازی ہو گا۔ یہ کیا ہوا دراز ستی۔۔۔۔ دراز دستی۔۔۔۔"

کج بحثی کا یہ سلسلہ بہرحال ختم ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں لڑے بلکہ یوں کہئے کہ ہم نے اس کا کبھی موقع ہی نہیں آنے دیا۔ گفتگو کرتے کرتے جب بھی کوئی خطرناک موڑ آیا تو عصمت نے رخ بدل لیا یا میں راستہ کاٹ کر ایک طرف ہو گیا۔

عصمت کو میں پسند کرتا ہوں۔ وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن اگر کوئی دفعتاً پوچھ بیٹھے "تم دونوں ایک دوسرے کی کیا چیز پسند کرتے ہو؟" تو میرا خیال ہے کہ میں اور عصمت دونوں کچھ عرصے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو جائیں۔

عصمت کی شکل و صورت دل فریب نہیں لیکن دل نشین ضرور ہے۔ اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کنی کی سفید ساڑھی' سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا چست بلاؤز' ہاتھ میں چھوٹا پرس' پاؤں میں بغیر ایڑی کی براؤن چپل' چھوٹی مگر تیز اور متجس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک چھوٹے مگر گھنگھریالے بال۔ میں عصمت پر عاشق نہ ہوا لیکن میری بیوی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ عصمت سے اگر صفیہ اس کا ذکر کرے تو وہ ضرور کچھ یوں کہے گی۔ "بڑی آئی ہو میری محبت میں گرفتار ہونے والی۔ تمہاری عمر کی لڑکیوں کے باپ تک قید ہوتے رہے ہیں میری محبت میں۔"

ایک بزرگوار اہل قلم کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ جو بہت دیر تک عصمت کے پریم پجاری رہے۔ خط و کتابت کے ذریعے سے آپ نے عشق فرمانا شروع کیا۔ عصمت شہ دیتی رہی لیکن آخر میں ایسا اڑنگا دیا کہ ثریا ہی دکھا دی غریب کو۔ یہ بچی کہانی میرا خیال ہے وہ کبھی قلم بند نہیں کریں گے۔

باہم متصادم ہو جانے کے خوف سے میرے اور عصمت کے درمیان بہت ہی کم باتیں ہوتی تھیں۔ میرا افسانہ کبھی شائع ہو تو پڑھ کر داد دے دیا کرتی تھی "نیلم" کی اشاعت پر اس نے غیر معمولی جوش و خروش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار

کیا۔ ”واقعی یہ بہن بنانا گیا ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ کسی عورت کو بہن کہنا اس کی توہین ہے۔“

اور میں سوچتا رہ گیا۔ وہ مجھے منٹو بھائی کہتی ہے اور میں اسے عصمت بہن کہتا ہوں۔ دونوں کو خدا سمجھے۔

ہماری پانچ چھ برس کی دوستی کے زمانے میں ایسا کوئی واقعہ نہیں جو قابل ذکر ہو۔ فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونوں گرفتار ہوئے۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہو چکا ہے لیکن عصمت کا پہلا موقع تھا۔ اس لئے بہت بھنائی۔ اتفاق سے گرفتاری غیر قانونی نکلی۔ کیوں کہ پنجاب پولیس نے ہمیں بغیر وارنٹ پکڑ لیا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئی لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آخر اسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

بمبئی سے لاہور تک کافی لمبا سفر ہے لیکن شاہد اور میری بیوی ساتھ تھے۔ سارا وقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور چڑانے کی خاطر ہم دونوں کی فحش نگاری پر حملے کرتے رہے۔ قید کی صعوبتوں کا نقشہ کھینچا۔ جیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے آخر میں جھلا کر کہا ”سولی پر بھی چڑھا دیں لیکن یہاں حلق سے انا الحق ہی نکلے گا۔“

اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ دونوں مرتبہ کالجوں کے تماشائی طالب علم مجھے اور عصمت کو دیکھنے کے لئے ٹولیاں باندھ باندھ کر عدالت میں آتے رہے۔ عصمت نے مجھ سے کہا ”منٹو بھائی‘ چودھری نذیر سے کہئے کہ ٹکٹ لگا دے کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہی نکل آئے گا۔“

ہم دو دفعہ لاہور گئے اور دو ہی دفعہ ہم دونوں نے کرنال شاپ سے مختلف ڈیزائنوں کے دس دس بارہ بارہ جوڑے سینڈلوں اور جوتیوں کے خریدے۔ بمبئی میں کسی نے عصمت سے پوچھا‘ لاہور آپ کیا مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے؟ عصمت نے جواب دیا ”جی نہیں جوتے خریدنے گئے تھے۔“

غالباً“ ساڑھے تین برس پہلے کی بات ہے۔ ہولی کا تہوار تھا۔ ملاڈ میں شاہد اور میں بالکنی میں بیٹھے پی رہے تھے۔ عصمت میری بیوی کو اکسا رہی تھی۔ ”صفیہ

یہ لوگ اتنا روپیہ اڑائیں، ہم کیوں نہ اس عیش میں شریک ہوں۔" دونوں ایک گھنٹے تک دل کڑا کرتی رہیں۔ اتنے میں ایک دم ہلڑ سا مچا اور فلمستان سے پروڈیوسر مکرجی ان کی بھاری بھرکم بیوی اور دوسرے لوگ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ چند منٹوں میں ہی ہمارا حلیہ ناقابل شناخت تھا۔ عصمت کی توجہ وہسکی سے ہٹی اور رنگ پر مرکوز ہو گئی" آؤ صفیہ ہم بھی ان کے رنگ لگائیں۔"

ہم سب بازار میں نکل آئے۔ چنانچہ گھوڑ بند روڈ پر باقاعدہ ہولی شروع ہو گئی "نیلے پیلے سبز اور کالے رنگوں کا چھڑکاؤ شروع ہو گیا۔ عصمت پیش پیش تھی۔ ایک موٹی بنگالن کے چہرے پر تو اس نے تارکول کا لیپ کر دیا۔ اس وقت مجھے اس کے بھائی عظیم بیگم چغتائی کا خیال آیا ایک دم عصمت نے جرنیلوں کے سے انداز میں کہا "آؤ، پری چہرہ کی گھر پر دھاوا بولیں۔"

ان دنوں نسیم بانو ہماری فلم "چل چل رے نوجوان" میں کام کر رہی تھی۔ اس کا بنگلہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ پر تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی چنانچہ چند منٹوں میں ہم سب بنگلے کے اندر تھے۔ نسیم حسب عادت پورے میک اپ میں تھی اور نہایت نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی وہ اس کا خاوند احسان ہمارا شور سن کر باہر نکلے۔ عصمت نے جو رنگوں میں لتھڑی ہوئی بھتنی سی لگتی تھی میری بیوی سے جس پر مزید رنگ لگانے سے میرا خیال ہے کوئی فرق نہ پڑتا۔ نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا "صفیہ، نسیم واقعی حسین عورت ہے۔"

میں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا "حسن ہے لیکن بہت ٹھنڈا۔"

عینک کے رنگ آلود شیشوں کے پیچھے عصمت کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھر میں اور اس نے آہستہ سے کہا "صفراوی طبیعتوں کے لئے ٹھنڈی چیزیں مفید ہوتی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور ایک سیکنڈ کے بعد پری چہرہ نسیم سرکس کا مسخرہ بنی ہوئی تھی۔

عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں۔ "منٹو بھائی اب جی چاہتا ہے مرغ اور مرغیوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں" یا "میں تو فوج میں بھرتی ہو جاؤں گی اور ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گی۔"

عصمت کی افسانہ نگاری پر کافی مضمون لکھے گئے ہیں' حق میں کم' خلاف زیادہ کچھ تو بالکل مجذوب کی بڑ ہیں۔ چند ایسے ہیں جن میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔

پطرس صاحب نے بھی جن کو لاہور کے ادبی ٹھیکیداروں نے ڈبیا میں بند کر رکھا تھا اپنا ہاتھ باہر نکالا اور قلم پکڑ کر عصمت پر ایک مضمون لکھ دیا آدمی ذہین ہیں طبیعت میں شوخی اور مزاح ہے اس لئے مضمون کافی دلچسپ اور سلجھا ہوا ہے۔ آپ عورت کے لیبل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ایک مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس (آپ کی مراد صلاح الدین صاحب سے ہے) نے بھی معلوم ہوتا ہے۔ انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں بھی وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانے میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔ گویا ادب کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں۔"

"جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلم۔ لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تک ہی ملا اور بوجھوں تو کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے جو خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جبلی اور بنیادی' جو انشا پرداز عورتوں کے ادب کو انشاء پرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ ہو بہر حال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنیاد پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔" ان سوالوں کا جواب بہت ممکن ہے ایسا نہ ہو جس کی بنیاد پر منصفین کو جنس کے اعتبار سے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے لیکن جواب دیتے وقت لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ سوال کرنے والا کون ہے مرد ہے یا عورت؟ کیوں کہ صنف معلوم کرنے پر سوال کرنے والے کا جبلی اور بنیادی زاویہ نگاہ بہت حد تک واضح ہو جائے گا۔ پطرس صاحب کا یہ کہنا کہ "گویا ادب بھی کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں

عورتوں اور مردوں کے بیچ علیحدہ ہوتے ہیں" ٹھیٹ پطرسی فقرے بازی ہے ٹینس ٹورنامنٹ ادب نہیں۔ لیکن عورتوں اور مردوں کے بیچ علیحدہ ہونا بے ادبی بھی نہیں۔پطرس صاحب کلاس میں لیکچر دیتے ہیں تو طلبہ اور طالبات سے ان کا خطاب جداگانہ نہیں ہوتا لیکن جب انہیں کسی شاگرد لڑکے یا شاگرد لڑکی کی دماغی نشوونما پر غور کرنا پڑے گا تو ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت میں وہ ان کی جنس سے غافل نہیں ہو جائیں گے۔

عورت اگر جارج ایلیٹ یا عصمت چغتائی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ادب پر اس کے عورت ہونے کے اثر کی طرف غور نہ کیا جائے۔ ہیجڑے کے ادب کے متعلق بھی کیا پطرس صاحب یہی استفسار فرمائیں گے کہ کیا کوئی مابہ الاامتیاز ایسا ہے۔ داخلی اور جبلی اور بنیادی جو انشاء پرداز ہیجڑوں کے ادب کو انشاء پرداز مردوں اور عورتوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے۔

میں عورت پر عورت اور مرد پر مرد کے نام کا لیبل لگانا بھونڈے پن کی دلیل سمجھتا ہوں۔ مسجدوں اور مندروں پر یہ بورڈ لگانا کہ یہ عبادت اور بندگی کی جگہیں ہیں بہت یہ مضحکہ خیز ہے لیکن جب کسی مسجد اور مندر کے مقابلے میں کسی عام رہائش گاہ کو رکھ کر ہم فن تعمیر کا جائزہ لیں گے تو اس پر مندر اور مسجد کی تقدیس کا اثر اپنے ذہن سے محو نہیں کر دیں گے۔

عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ادب کے ہر ہر نقطے میں موجود ہے۔ جو اس کو سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہبری کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں سے جن کو پطرس صاحب نے اپنے مضمون میں غیر جانب داری سے بیان کیا ہے۔ ہم مصنف کی جنس سے علیحدہ نہیں کر سکتے اور نہ ایسا کرنے کے لئے کوئی تنقیدی' ادبی یا کیمیائی طریقہ ہی موجود ہے۔

"سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر دکھا دیا تھا" (تل)

"پسینے سے گل چکے تھے اور ان میں مرگھٹ جیسی چراند ---- آنے لگی تھی۔" (جال)

"مردانہ قمیص۔ سگریٹ کی بو میں غرق ملگجی سی۔" (ہیرو)

"نیچے کیاریوں میں سے دھنیئے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی (میرا بچہ)
عصمت کی سب حسیں وقت پڑنے پر اپنی اپنی جگہ کام کرتی ہیں اور ٹھیک طور سے کرتی ہیں۔ عزیز احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جنس ایک مرض کی طرح عصمت کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ ممکن ہے ان کی طرح عصمت کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ اس مرض کے لئے نسخے تجویز نہ فرمائیں۔ یوں تو لکھنا بھی ایک مرض ہے۔ کامل طور پر صحت مند آدمی جس کا درجہ حرارت ہمیشہ ساڑھے اٹھانوے ہی رہے۔ ساری عمر اپنی زندگی کی ٹھنڈی سلیٹ ہاتھ میں لئے بیٹھا رہے گا۔

عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں۔

"عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔ عشق ایک ایسی چیز ہے جس کا جسم سے وہی تعلق ہے جو بجلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دیا تو یہی عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے۔ دوپہر کی جھلستی لو میں پنکھا جھلتا ہے ہزاروں دیوؤں کی طاقت سے زندگی کی عظیم الشان مشینوں کے پہیئے گھماتا ہے ا.ر کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر استری کرتا ہے ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیت مصنفہ واقف نہیں۔"

ظاہر ہے کہ عزیز احمد صاحب کو اس کا افسوس ہے۔ مگر یہ عشق جس سے عزیز احمد صاحب واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے پنج سالہ اسکیموں کے ماتحت، تیار کیا ہے اور اب وہ اسے ہر انسان پر عائد کر دینا چاہتے ہیں۔

عزیز احمد صاحب کو خوش کرنے کے لئے میں فرض کر لیتا ہوں کہ عصمت کی ٹریجڈی کیسے وقوع پذیر ہوتی کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔

عصمت واقعی عزیز احمد کے تصنیف کردہ عشق سے ناآشنا ہے اور اس کی یہ ناآشنائی ہی اس کے ادب کا باعث ہے اگر آج اس کی زندگی کے تاروں کے ساتھ اس عشق کی بجلی جوڑ دی جائے اور کھٹکا دبا دیا جائے۔ تو بہت ممکن ہے ایک اور

عزیز احمد پیدا ہو جائے۔ لیکن "تل" "گیندا" "بھول بھلیاں" اور "جال" تصنیف
کرنے والی عصمت یقیناً مر جائے گی۔

عصمت کے ڈرامے کمزور ہیں۔ جگہ جگہ ان میں جھول ہے۔ عصمت پلاٹ
کو مناظر میں تقسیم کرتی ہے تو ناپ کر قینچی سے نہیں کرتی۔ یوں ہی دانتوں سے چیر
پھاڑ کر چیتھڑا بنا ڈالتی ہے۔ پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں اس میں وہ بالکل
اجنبی رہتی ہے۔ جنس عصمت کے اعصاب پر ایک مرض کی طرح سوار ہے۔
عصمت کا بچپن بڑا غیر صحت بخش رہا ہے پردے کے اس پار کی تفصیلات بیان میں
عصمت کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں سے شغف ہے۔
شخصیتوں سے نہیں اشخاص سے ہے عصمت کے پاس جسم کے احتساب کا ایک ہی
ذریعہ ہے اور وہ مساس---- عصمت کے افسانوں کی کوئی سمت ہی نہیں----
عصمت کی غیر معمولی قوت مشاہدہ حیرت میں غرق کر دیتی ہے---- عصمت فحش
نگار ہے ---- ہلکا ہلکا طنز اور مزاح عظمت کے اسٹائل کی ممتاز خوبیاں ہیں----
عصمت تلوار کی دھار پر چلتی ہے۔

عصمت پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کوئی اسے پسند کرے گا
کوئی ناپسند۔ لیکن لوگوں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے زیادہ اہم چیز عصمت کی
تخلیقی قوت ہے۔ بری، بھلی، عریاں، مستور جیسی بھی ہے قائم رہنی چاہیے۔ ادب کا
کوئی جغرافیہ نہیں ہے۔ اسے نقشوں اور خاکوں کی قید سے جہاں تک ممکن ہو بچانا
چاہیے۔

عرصہ ہوا دہلی کے ایک ذات شریف درویش نے عجیب و غریب کی۔ آپ
نے "اوروں کی کہانی میری زبانی' اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا" جیسے
عنوان سے شائع کی۔ اس میں میرا، عصمت، مفتی، پریم چند، خواجہ محمد شفیع اور عظیم
بیگ چغتائی کا ایک ایک افسانہ شامل تھا۔ دیباچے میں ترقی پسند ادب پر ایک تنقیدی
چوٹ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق فرمائی گئی تھی اور اس کارنامے کو اپنے دو
ننھے ننھے بچوں کے نام سے معنون کیا گیا تھا۔ اس کی ایک کاپی آپ نے عصمت کو

اور مجھے روانہ کی عصمت کو درویش کی یہ ناشائستہ اور بھونڈی حرکت سخت ناپسند آئی۔ چنانچہ بہت بھنا کر مجھے ایک خط لکھا۔

"منٹو بھائی آپ نے وہ کتاب جو درویش نے چھاپی ہے دیکھی؟ ذرا اسے پھٹکاریئے اور ایک نوٹس دیجئے۔ نجی طور پر کہ ہر مضمون کا جرمانہ دو سو روپے، دو ورنہ دعویٰ ٹھونک دیں گے۔ کچھ ہونا چاہئے۔ آپ بتایئے کیا کیا جائے۔ یہ خوب ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے اٹھا کر ہمیں کیچڑ میں لتھیڑ دیتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہتے ذرا مزہ رہے گا۔ اس شخص کو خوب رگڑیئے ڈالئے کہ الٹا علم بردار کیوں بن رہا ہے عریاں ادب کا اس نے ہمارے افسانے صرف کتاب فروخت کرنے کے لئے چھاپے ہیں ہماری ہتک ہے کہ ہرایرے غیرے نتھو خیر۔ کم عقلوں کی ڈانٹیں سننا پڑیں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو سامنے رکھ کر ایک مضمون لکھئے۔ آپ کہیں گے میں کیوں نہیں لکھتی تو جواب ہوے کہ آپ پہلے ہیں۔"

جب عصمت سے ملاقات ہوئی تو اس خط کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا "سب سے پہلے لاہور کے چودھری محمد حسین صاحب ہیں ان سے ہم درخواست کریں تو وہ ضرور مسٹر درویش پر مقدمہ چلوا دیں گے۔"

عصمت مسکرائی "تجویز ٹھیک ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم بھی ساتھ دھر لئے جائیں گے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا---- عدالت خشک جگہ سہی لیکن کرنال شاپ تو کافی دلچسپ جگہ ہے---- مسٹر درویش کو وہاں لے جائیں گے" اور---- عصمت کے گالوں کے گڑھے گہرے ہو گئے۔

چڑی کی دُکی

نام تو ان کا عبدالحیٔ تھا مگر دل والیاں انہیں پیار سے "ہائے" کہا کرتی تھیں۔ وہ تھے بھی سر سے پاؤں تک ایک حسین اور دلچسپ ہائے۔ گنی سونے کی طرح دمکتا رنگ، سورج کی کرنوں کو شرما دینے والے خم دار بال، گہری سبز آنکھیں---- ایسی کہ ایک بار کوئی جی بھر کے ان میں جھانک لے تو جنم جنم گھنیرے جنگلوں میں بھٹکتا پھرے۔ میٹھی میٹھی مسکراہٹ ایک قہر کہ شہید ہونے کو جی چاہے۔ انہیں دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آجاتی تھی معلوم ہوتا تھا بڑی فرصت سے مزے لے لے کر انہیں گڑھا ہے----

کم سنی ہی سے انہیں دل دکھانے کا چسکہ پڑ چکا تھا۔ گرد و نواح کی تقریباً سب لڑکیاں وقتاً فوقتاً دل ہار چکی تھیں۔ جس محفل میں چلے جاتے دل والیوں کے کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ شوہر اپنی بیویاں سمیٹ کر چوکنے ہو جاتے۔ کنواریوں کی مائیں فوراً ان کی بہنوں اور ماں پر واری---- صدقے ہونے لگتیں۔ کالج میں ہی تھے کہ پیغام جھڑنے لگے۔ نوکر ہوئے ہی تو لوگوں نے یلغار بول دی۔ بہنوں کی سہیلیوں کی تعداد اس تیزی سے بڑھی کہ شمار کرنا مشکل ہو گیا۔ دے دعوتوں پہ دعوتیں ہونے لگیں۔ ایک سے ایک تیکھی سلونی حسینہ مع گاڑیوں جہیز سے انہیں جیتنے پر تل پڑی۔

اگر بزاز پچاس ساٹھ تھان کھول کر سامنے پھیلا دے تو عقل اوندھ جاتی ہے۔ انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی حال بیچارے "ہائے" کا ہوا۔ کبھی ایک پسند آئی کبھی دوسری کبھی ایک ساتھ کئی کئی پسند آجاتیں---- اور پھر سب جی سے اتر جاتیں۔ کوئی ان کے مقابلے کی تھی بھی کہاں؟ وہ تھے بھی حکم کا اکا۔ ان کے سامنے کوئی پان کا اٹھا تھا تو کوئی نہلا دہلا۔ ویسے دل والیاں تو چوئے پنجے سے زیادہ نہیں

تھیں۔ جانتی تھیں' وہ ان کی دست رس سے باہر ہیں۔ مگر دل سے مجبور تھیں' انہیں دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے اور آنسوؤں سے تکئے بھگونے سے انہیں کوئی روک سکتا تھا۔

اور بے چاری عالمہ نری پان کی دگی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے سینے میں شاید دل نہیں تھا' کیونکہ اگر دل ہوتا تو وہ ضرور "ہائے" کے دودھ جیسے سفید پیروں تلے لوٹتا ہوتا۔ بدصورت انسان سے انہیں چڑ تھی۔ خاص طور سے عورت کو تو بد صورت ہونے کا حق ہی ان کے نزدیک نہ تھا؟ وہ کہتے تھے کہ اگر عورت حسین نہیں تو ہے ہی کیوں؟ اسی لئے عالمہ کو دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جی بھر کے کالی' اوپر سے سینک سلائی کہ سوئی کے ناکے میں سے گھسیٹ لو---- مجسم معشوق کی کمر تھیں۔ لوگ ان کے والدین پر ترس کھایا کرتے تھے کہ نہ جانے کس جنم کی سزا بھگت رہے ہیں۔ یہاں اچھی بھلی حسین جہیز والیاں اٹھائے نہیں اٹھتیں۔ یہ اللہ کی رحمت' اسے کون اللہ والا سمیٹے گا؟----

سینک سلائی دھری تھیں' مگر صحت بنانے کا بڑا شوق تھا۔ روزانہ شام کو ریکٹ ہلاتی آدھمکتیں۔ برسوں سے بیڈمنٹن کھیلنے پر تلی ہوئی تھیں مگر مجال ہے جو ایک ہاتھ بھی مار جائیں' سارے کورٹ پر مکوڑے کی طرح اول جلول پھدکا کرتیں۔ اس اناڑی پن پر جل کر ہائے فوراً ریکٹ پھینک کر دھم سے سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔

"ارے عبدالحئ صاحب اتنے جلدی تھک گئے!" وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پٹپٹاتیں۔ لفظ عبدل سے ہائے کو چڑ تھی' جیسے اوپر کے کام کا چھوکرا۔

"ورزش کیجئے عبدالحئ صاحب ورنہ موٹے تھل تھل ہو جائیں گے----"

"شکریہ آپ کی رائے کا عالمہ خاتون صاحبہ ----"

"پھر........"

"ہاں پھر؟"

"کچھ نہیں----" عالمہ ٹال گئی۔

"نہیں صاحب تکلف نہ کیجئے---- کہئے نا؟"

"بے چاری دل والیوں کے خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔" عالمہ بد صورت ہی نہیں بدذوق بھی تھیں۔

اس رات کسی کے حسین تصور میں غرق ہونے کی بجائے عبدالحئی غصہ سے پھنپھناتے رہے' "کالی مائی۔ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے! کم بخت مری ہوئی چھپکلی! خدا قسم ابکائی آتی ہے۔"

جب عالمہ کو معلوم ہوا کہ حئی اسے چڑی کی دُگی کہتے ہیں، تو وہ گلہری کی طرح مہین مہین آواز میں خوب ہنسی کہنے لگی' "چلو زندگی میں ایک بات تو عقل کی کہی۔" دل والیاں ہائے کے بارے میں ایسی گستاخی کی باتیں سن کر لرز اٹھیں۔

"تمہارے سینے میں تو دل نہیں' جوتے کا تلا ہے۔" وہ جل کر کہتیں۔

"تلا بڑے کام کی چیز ہوتی ہے پاؤں میں کنکر نہیں چبھتے۔" عالمہ فلسفہ جھاڑتی۔ "کیا ارادہ ہے؟ کیا عمر بھر شادی نہیں کرو گی؟"

"کروں گی کیوں نہیں؟"

"اور محبت؟"

"محبت بغیر شادی کب ہوتی ہے۔ وہ تو طلاق ہوتی ہے۔" کوئی بھلا آدمی ملا تو نہایت شان دار عشق کیا جائے گا۔ پھر......"

"ہائے' کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ذکر بھلے آدمی کا تھا۔"

"تو وہ بھلے آدمی نہیں۔"

"توبہ کرو۔ بھلے آدمی تو کیا ان کو تو آدمی کہنا ہی دغا بازی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے.....؟"

"عبدالحئی آدمی نہیں' معشوق ہیں! بھئی مجھ سے تو معشوق نہ جھیلے جائیں۔ ارے کہاں میں نخرے اٹھاتی پھروں گی۔"

"تو تم سمجھتی ہو کوئی تمہارے نخرے اٹھائے گا؟"

"ضرور اٹھائے گا؟"

"کون؟"

"جسے غرض ہو گی وہ نخرے اٹھائے گا ہی"

"کبھی آئینے میں منہ دیکھا ہے؟"

"روز دیکھتی ہوں۔ اور آئینے سے پوچھتی ہوں' آئینے رے آئینے! ہے کوئی دنیا میں مجھ سے زیادہ حسین' آئینہ کہتا ہے' اجی توبہ کیجئے۔" عالمہ اپنی بدصورتی کا خوب مذاق اڑاتی۔

ایک نسخہ تھا تیر بہدف ہزار بار کا آزمایا ہوا۔ جس کے استعمال سے عبدالحیٔ ہمیشہ سرخ رو ہوئے تھے ---- اور وہ تھا عشق کے میدان میں دشمن کو للکارنا' اسے اپنے عشق میں گرفتار کر کے سسکا سسکا کر اس کا حلیہ بگاڑ دینا۔ سخت گتھم بازی کی ضرورت ہوتی ہے اس فن میں یوں دھڑے لڑکیاں پہل کر کے عاشق ہونے کی عادی نہیں' پہلے ان پر عاشق ہونے کا مکمل ناٹک کھیلنا پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کا کھیل ناٹک ہی بن گیا۔ پہلی لڑکی سے انہیں خود بخود عشق ہو گیا تھا سولہ برس کے تھے وہ بھی اتنی ہی ہو گی۔ مگر انہیں شادی کے بازار میں ابھی آنے میں دیر تھی' چنانچہ دو سال بعد لڑکی کی شادی ہو گئی۔ اور جب یہ برسر روزگار ہوئے تو وہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس عرصے میں انہوں نے کئی عشق کئے۔ عشق کی مشق سے ان میں بڑی پختگی آئی۔ ایسے ایسے گر انہوں نے سیکھے کہ خود کورے نکل آئیں اور مقابل چت ہو جائے۔ ہاتھ اتنا صاف ہو گیا کہ پلک جھپکتے فتوحات حاصل ہونے لگیں۔ نظر بھر کے دیکھا' دو چار چبھتے ہوئے جملے تلی ہوئی آواز میں سرکائے گمبھیر ہری ہری آنکھوں سے پھندا پھینکا اور مال غنیمت سمیٹ کر چل نکلے۔"

مگر بد صورت لڑکیوں سے اظہار عشق کوئی کیسے کرے؟ بد صورت لوگ اپنے گرد چٹانیں کھڑی کر لیتے ہیں۔ تلا مضبوط ہو تو کانٹا ٹوٹ جاتا ہے۔ کم سن بھولی بھالی حسینہ کو بہلانا تو انہیں آتا تھا۔ اور کسے نہیں آتا؟ مگر عالمہ کی تو وہی مثل تھی۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ راہ بنانے کے لئے کوئی تو روزن چاہئے۔ کھڑنجے سے سر پھوڑنا کہاں کی دانش مندی ہو گی؟

ایسی بے بسی ان پر کبھی نہ چھائی تھی۔ ساری دل والیاں بھی مل کر اس ایک زخم کا مرہم نہ بن سکیں جو عالمہ کی اس قلعہ بندی سے رسنے لگا تھا۔ انہوں نے

بہت جال پھینکے، لیکن جلی کٹی بحثوں کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا- سوچا ظاہری حسن کے ذکر سے کتراکر کچھ روحانی حسن کا ذکر چھیڑا جائے- مگر عالمہ فزکس میں ریسرچ کر رہی تھی- بھوت پریت سے اسے دلچسپی نہ تھی- ویسے وہ کچھ زیادہ باشعور اور خوش خو بھی نہ تھی- نہایت تُری، کج بحث، آواز میٹھی تھی مگر باتیں کڑوی کسیلی-

حسنی چڑ گئے- کھسیانی بلی بن گئے- اب وہ مذاق میں قہقہے لگا کر اپنی امی سے کہتے، "بھئی اس حسینہ" مہ جبیناں کو ہمارا پیغام بھیج دو کہ ہم اس پر ایک چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو چکے ہیں- اے پری رو، رحم فرما! واللہ امی، لڑکی ذات یہ حرکتیں کرتی تو اماں کی ناک چوٹی کٹ جاتی- لیکن بیٹے کی ہر دلعزیزی پر وہ بھی پھولی نہ سماتی تھیں- جب کسی لڑکی سے پینگ بڑھاتے تو وہ بھی ہونے والی بہو پر عاشق ہو جاتیں- اس کے وہ چاؤ چونچلے کرتیں کہ توبہ- پھر جب حسنی اُکتا جاتے اور ان کا رویہ بدل جاتا تو ماں کا عشق بھی یک لخت رفو چکر ہو جاتا، بہنیں بھی رکھائی برتنے لگتیں- سچ ہے، وہی سہاگن ہے جس کو پیا چاہے- ایک دم اس کے خاندان سے کسی بات پر لڑ بیٹھتیں اور بیٹے کی بچ رکھنے کو کہہ دیتیں، "اے بھئی اس لڑکی کے طور طریق ٹھیک نہیں چڑھ چڑھ کے ناحق آتی ہے-" اس کے بعد جھٹ اس لڑکی کی شادی ہو جاتی یا کہیں دل کی مرمت کرانے روانہ کر دی جاتی- اور نئی امیدوار کے سامنے ماں بہنیں مل کر خوب اس کا مذاق اڑاتیں-

"اے حسنی ذرا سیدھے منہ بات کر لیتا تھا تو اتار وہی ہو گئیں مجھے تو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی تھی-" پھر سب مل کر کوئی نئی لڑکی پسند کرتیں- اس کا آنا جانا بڑھا کیں پھر سہرے کے پھولوں اور چڑھاوے کے سہانے ذکر چھیڑتے- مگر عالمہ کے لئے مذاق میں بھی پیغام بھیجنے کا ذکر سن کر چاہت کی ماری امی سہم گئیں-

"نا بیٹا، یہ مذاق پرائی لڑکی کا اڑانا اچھا نہیں، جو اللہ نہ کرے ان کے باوا نے قبول کر لیا اور......."

"تو کیا ہوا؟ بس چاند سی بہو لائیے گا-"

"مجھے ایسی باتیں ذرا نہیں بھاتیں- ان کے باوا ویسے ہی خر دماغ ہیں-"

"تو کیا ہم ان کی صاحبزادی کو گالی دے رہے ہیں- پیغام ہی تو بھیج رہے ہیں-

"چل ہٹ دیوانے۔ وہ تو سر آنکھوں پر اٹھائیں گے پیغام۔"
شرارت حد سے گزر جائے تو کمینہ پن بن جاتی ہے۔ یہ مذاق کچھ اتنا بڑھا کہ بات عالمہ کے کانوں تک پہنچی۔ سب نے سوچا کہ سن کر رو ہی تو پڑے گی۔
مگر توبہ کیجئے جناب! عالمہ نے سنا تو کان پر ہاتھ رکھ کر بولی "نا بابا۔ میں کہاں حلبیوں کی تھال پر سے ساری عمر مکھیاں اڑاتی پھروں گی۔ بدالحئی صاحب ٹھہرے معشوق ان میں کسی کا شوہر یا بچوں کا باپ بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ مجھ جیسی بد صورت عورت کی بھی یہ سزا نہیں ہونا چاہئے۔ ایسا چھبیلا دولھا مجھے کیسے ہضم ہو گا؟"
"انگور کھٹے والی بات ہے۔ ایسا حسین دولھا مل جائے تو....." دل والیاں کلس گئیں۔
"نا بھئی، میں کیا کروں گی حسین دولھا کا؟ کوئی مجھے کرائے پر چلانا ہے؟"
حئی نے سنا تو انار کی طرح چھوٹ نکلے "بہت سور ہے کم بخت! صورت سے بڑھ کر دل کالا ہے۔"
ادھر عالمہ اپنے تھیسس پر لگی ہوئی تھی۔ بیڈ مٹن کبھی کا ختم ہو گیا تھا۔ اس کا ذکر بھی پھیکا پڑ چکا تھا۔ فضا کند تھی۔ حئی نے بوکھلا کر دو تین اور ہاتھ مارے۔ ایک بت کافر پاکستان سے بھی آئی۔ مگر معلوم ہوا کہ مال ایکسپورٹ کے لئے نہیں، ہاں دولہا کو امپورٹ کیا جا سکتا ہے مع امریکن فرم میں نوکری۔ عالمہ نے سنا تو بلک اٹھی۔ "اے ہے انہیں ایکسپورٹ کر کے چلغوزے منگوا لئے جائیں۔ اللہ کتنا فائدہ رہے گا قوم کا بھی فائدہ اور ملک بھی سرخرو-----"
دل والیاں لڑ پڑیں۔ انگور کھٹے اس لئے تھو تھو، جو مل جائیں تو ہپ ہپ۔
مگر عالمہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ عبدالحئی خاں کا وجود قوم اور ملک کے لئے فخر کی بات نہیں۔ ویسے عورت ذات کے لئے تو وہ زہریلا ہل ہیں۔ وہ دلوں سے کھیلتے ہیں اور کھیلتے رہیں گے۔ بوڑھے کھوسٹ ہو جائیں گے پر یونہی میدان مارتے رہیں گے۔ نہ جانے کتنے گھر بگاڑیں گے کتنوں کی بیویاں بھگائیں گے۔ اور کتنوں کا دل خاک میں ملائیں گے۔ حئی نے سنا تو خوب ہنسے بد

"دراصل عالمہ مجھ پر بری طرح عاشق ہے۔ ایس لئے مجھ بدنام کر رہی ہے کہ سب مجھ سے خوفزدہ ہو جائیں تو......"

اماں بہنیں تو عالمہ کو کوسنے لگیں۔ جل ککڑی مردار اور نئی امیدوار کے خواب دیکھنے لگیں۔ اے ہے لوگو غضب ہے کہ نہیں۔ شہزادوں کو شرما دینے والی صورت شکل، کماؤ پوت اور کنوارا بیٹھا ہے۔ کبھی دیکھا نہ سنا۔

عبید صاحب، فزکس کے پروفیسر عالمہ کو تھیسس لکھنے میں مدد دیتے تھے۔ چالیس پینتالیس برس کے ہوں گے بیوی کچھ سال ہوئے، دو بچے چھوڑ کر مر چکی تھیں۔ ان کی طرف سے عالمہ کے لئے پیغام آیا جو منظور کر لیا گیا۔ عالمہ کی بھی مرضی تھی۔جسی نے سنا تو قہقہوں سے گھر سر پر اٹھا لیا۔

"رام ملائے جوڑی، ایک اندھا ایک کوڑھی۔ چلو دو گھر نہیں بگڑے۔"

جب شادی کی مبارکباد دینے گئے تو یوں ہی کہہ دیا "مگر آپ نے بھی کس بور سے شادی کا فیصلہ کیا ہے----"

"خیر زیادہ بور تو نہیں----"

"بہت زیادہ بور ہیں۔ دوسرے ان کی شکل نہایت خطرناک ہے۔ گنجے الگ ہیں----"

"مجھ سے بھی زیادہ خوف ناک شکل ہے؟"

"قطعی، ان کے سامنے تو آپ حسین ہیں۔"

"سچ؟ بس تو پھر اس سے بہتر جوڑ کہاں ملے گا۔ دلہن سے زیادہ حسین ہونا چاہئے۔" عالمہ چہکی۔

"بڈھے الگ ہیں۔"

"دلہن کو دولہا سے کم سن ہونا چاہئے۔"

آپ کو ان سے محبت ہے؟"

"آپ کون ہوتے ہیں یہ پوچھنے والے؟"

"آپ تو جانتی ہیں محبت میری ہابی ہے، اس لئے...."

"او..... تھیسس تیار کر رہے ہیں؟" عالمہ ہنس پڑی۔

"ہو سکتا ہے؟"

"میری تھیسس ٹائپ ہو کر آ جائے تب....."

"فرصت سے عشق کا پروگرام بنے گا۔" حیٔ نے لقمہ دیا----

"ایں؟ خیال برا نہیں۔"

"باقاعدہ پروگرام بنا کر۔ حیٔ بھنّا اٹھے" "معاف کیجئے گا یہ نہایت چغد پن کی بات ہے---- ایسے محبت کی جاتی ہے؟---- گویا یہ بھی تھیسس ہو گئی۔"

"کیوں؟ وہ آپ ایکسپرٹ ہیں نا۔ ٹھیک' بالکل ٹھیک---- تو آپ کی قیمتی رائے سے اگر مستفید ہو سکوں تو---- ویسے کچھ آپ سے سیکھا تو ہے۔ اندازا" کچھ مشکل کام نہیں۔ آپ تو مشاق ہیں کھٹا کھٹ پانچ منٹ میں میدان صاف۔" عالمہ نے چٹکی بجا کر کہا۔

"آپ قطعی اناڑی ہیں۔"

"اونھ کوئی مضائقہ نہیں۔ عبید صاحب کچھ عشق وشق کے ساتھ دلچسپی نہیں رکھتے۔ نہایت پریکٹیکل قسم کے آدمی ہیں۔"

"آپ ان کے ساتھ خوش رہ سکیں گی؟"

"خوش رہنا اتنا مشکل کام نہیں۔ اپنا نجی فعل ہے جہاں تک میرا تعلق ہے غریبی' بد صورتی' بری صحت' کوئی بلا بھی مجھے آج تک پست نہ کر سکی۔ مجھے یقین ہے میں بہت خوش رہوں گی۔"

"یہ شادی نہیں ہو گی!"

"کیوں؟"

"کیوں کہ آپ عشق کی ہتک کر رہی ہیں۔"

عالمہ اور عبید صاحب کی شادی نہیں ہو سکی۔ حیٔ نے عبید صاحب سے جا کر صاف صاف کہہ دیا کہ عالمہ ان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔

"کیوں؟" عبید صاحب بھونچے رہ گئے۔

"کیوں کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔"

"ہیں؟ کس سے؟"

"مجھ سے!" حبّی نے مسکین صورت بنا کر آنکھیں جھکا لیں۔

"مگر....... مگر آپ!"

"جی----" حبّی نے گردن جھکا لی۔

حبّی کے جانے کے بعد عبید صاحب کو یقین ہو گیا کہ عاشق واقعی اندھا ہوتا ہے۔ گھر میں صف ماتم بچھ گئی....... مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

"اس غریب کی زندگی برباد کر کے تجھے کیا ملا؟" اماں نے آنسو بھر کے کہا "اس بدنامی کے بعد اب نگوڑی کو کون قبول لے گا؟"

"میں ہی بھگتوں گا کم بخت کو۔" حبّی نے منہ لٹکا لیا عالمہ نے طوفان سر پہ اٹھا لیا۔ "قیامت ہو جائے میں اس پگلے سے شادی نہیں کروں گی۔ اس لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے کہ سب عورتیں اس پر رحم کھا کر مہربانیاں کرتی رہیں۔

"پگلا کیسے ہوا؟" لوگوں نے پوچھا۔ "تمہیں پسند کرتا ہے اس لئے؟"

"ہاں اسی لئے۔ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے جو کوئی باہوش و حواس انسان پسند کرے۔"

کیا کیا ہنگامے ہوئے۔ خود کشیوں کی دھمکیاں چلیں۔

"ہائے تجھے تو چڑی کی دگی سے گھن آتی تھی۔" اماں بلکیں۔

"وہ تو آتی ہے اور آتی رہے گی۔"

"پھر تجھے کیا ہو گیا ہے میرے لال، کیوں اپنی زندگی مٹی میں ملا رہا ہے؟"

"کالی مائی نے جادو کر دیا ہے۔" حبّی نے مسکین صورت بن کر کہا، اور بڑی دھوم دھام سے اپنی زندگی مٹی میں ملا دی۔

"دیکھ لینا چار دن میں طلاق دے کر میکے پھنکوا دے گا سب نے پیشن گوئی کی۔

آج اس "حادثے" کو گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ اس بے ہنگم جوڑے کو دیکھ کر دل سے ایک لمبی چوڑی ہائے نکل جاتی ہے۔

سچ ہے چڑی کی دُگی اگر ٹرپ کی ہو تو حکم کا اکا کٹ جاتا ہے۔

وہ کون تھا؟

قدرت جب ستم ظریفی پر اتر آئے تو حضرت انسان کا تماشا بنا دیتی ہے۔ ٹھاکر صاحب ہرنام سنگھ نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ انہیں اتنے بڑے امتحان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یا تو اولاد دینے ہی میں خدا نے غفلت کی اور پھر دیے تو ایک دم دو بیٹے! بیٹا تو ان کے ہاں ایک ہی پیدا ہوا لیکن ایک سے دو کیسے ہو گئے؟ یہ بھی ایک عجیب و غریب قصہ ہے۔

ٹھکرائن جب بیاہ کر آئی تھیں تو مشکل سے پندرہ سال کی ہوں گی۔ راجستھانی حسن جمال کا اچھوتا مجسمہ ٹھاکر صاحب ان سے بارہ سال بڑے تھے' خود بھی اکلوتے تھے اور بڑی جائیداد کے تنہا وارث۔ پتا کا دیہانت ہو چکا تھا' بوڑھی ماتا کو پوتا کھلانے کا بے انتہا ارمان تھا۔ لیکن ساری منتیں مرادیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ ٹھکرائن کی گود نہ بھری انہوں نے بیٹے کا دوسرا بیاہ کرنا چاہا۔ لیکن وہ اکڑ گئے ٹھکرائن پر سوت لانے کا وہ خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔

لیکن بیس برس پورے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ خدا کو ان پر رحم آگیا' بچے کی آمد کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں' ماتا جی نے اتنے کرتے اور پوتڑے سلوائے کہ چار بچوں کو پورے پڑ جاتے ایک الگ کمرہ سجایا گیا نیلا ہلکا نیلا کمرہ جس کی چھت پر ستارے ٹکے تھے۔

جھاگ جیسے لیس کے پردے اور سفید پنگورا جس کے پائے پٹیوں پر گنگا جمنی نقش تھے اور چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں جڑی تھیں کہ بچہ کروٹ بھی لے تو گنگنا اٹھیں ان گھنٹیوں کو کچھ اس طرح لگایا گیا تھا کہ جب ہلتی تھیں تو ساتوں سُر بجتے تھے اور کچھ ایسی سریلی آسمانی موسیقی ابھرتی تھی جیسے فرشتے لوریاں گنگنا رہے ہوں اور بھی طرح طرح کے کھلونے سجائے گئے۔ ماتا جی تو بچے کے کمرے سے ایسے کھیلتی تھیں

جیسے بچیاں گڑیوں کے گھر سے کھیلتی ہوں۔ ایک طرف چھوٹی سی میز پر گھٹنوں چلتے بال کرشن جی سجا دیئے گئے' ان کے سامنے چھوٹے چھوٹے دیوں کی قطار رکھی تھی جن میں لو کی جگہ لمبوترا آدھ انچ کا بلب جڑا ہوا تھا۔

ٹھکرائن کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ ماتا جی ان کے لئے املیاں تڑوا کر کھٹا مٹھا کچومر بنواتیں۔ یہ املی کا پیڑ رحمت مائی کے چھوٹے سے آنگن میں تھا وہ روز گدر املیاں توڑ کر رنگ برنگی ٹوکری میں بھر کے دے جاتے۔ خود اس کی بیٹی کے بھی بال بچہ ہونے والا تھا۔ اس کا میاں بلوے میں مارا گیا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے اپنی کوٹھی کے احاطہ میں اسے پناہ دے دی تھی۔ رحمت مائی کو کچھ کم سنائی دیتا تھا اس کی بدنصیب بیٹی صغیرا دنیا سے منہ موڑے کھاٹ پر پڑی آنسو بہایا کرتی تھی' دن پر دن اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔

جس وقت ٹھاکر صاحب کے لال نے جنم لیا کوٹھی کے کونے سے ماتم کی صدا بلند ہوئی' صغرا بچہ پیدا ہونے کے دس منٹ بعد چل بسی۔ کوئی دائی بھی بلانے کی نوبت نہ آئی۔ اچانک ہی بچہ پیدا ہو گیا۔ رحمت مائی کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ آنول کیسے کاٹا جائے۔ مہترانی کو اس نے ہاتھ نہ لگانے دیا۔ ویسے ہی بچے کو جھولی میں ڈال کے ٹھاکر صاحب کے پاس پہنچی' وہ خود بوکھلائے ہوئے تھے۔

اسے ڈاکٹرنی کے پاس لے جاؤ۔ نال تو کاٹ دیں کچھ ہو نہ جائے بچے کو! انہوں نے جلدی سے مائی کو اندر بھیجا' ایسے سمے رحمت مائی کا اندر جانا کچھ ماتا جی کو اچھا نہ لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ روکتیں رحمت مائی اندر گھس گئی۔ نرس نے بچے کو لے کر تولیہ میں لپیٹا اور میز پر لٹا دیا کیونکہ ادھر مائی نے کمرے میں قدم رکھا بچے کا نال کاٹنے تک نرس نے مائی کے نواسے کا بھی نال کاٹ دیا۔ کیا گول مٹول بچے تھے ڈاکٹرنی نے ٹھاکر صاحب کے بچے کو نہلا کر سفید فراک پہنایا۔ لیکن باندھ کر اس کی دادی کی گود میں ڈال دیا۔ ان کے آنسو نکل آئے' جھٹ ہاتھ سے دس تولہ سونے کے کڑے اتار کر ڈاکٹرنی کو پہنا دیئے اور پوتے کی بلائیں لینے لگیں۔ ٹھاکر صاحب بھی کھڑے مسکرا رہے تھے۔

نرس نے ڈاکٹرنی سے کچھ کہا' وہ تیوریاں چڑھا کر جلدی سے اندر گئی' ٹھکرائن بچے کو پہلو میں لٹائے مسکرا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کیلئے ڈاکٹرنی سناٹے میں رہ گئی۔

اور قدرت نے ایک قہقہہ لگایا کیونکہ اس کے بعد بوکھلاہٹوں کا ایک طوفان سارے گھر پر ٹوٹ پڑا' ٹھکرائن کہتی تھیں جو بچہ نرس نے ان کی گود میں دیا وہی ان کا سپوت ہے۔

مگر دادی اماں نے جس پوتے کی بلائیں لے کر سونے کے کڑے ڈاکٹرنی کو دیئے تھے وہ اپنے گود والے بچے کو ہی پوتا ماننے پر بضد تھیں۔ مگر یہ سب ہوا کیسے؟ ڈاکٹرنی پورے یقین سے کہہ سکتی تھی کہ جو بچہ اس نے ماتا جی کی گود میں دیا' وہی ٹھاکر صاحب کا بیٹا ہے لیکن نرس کہتی تھی اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے ٹھاکر صاحب کے بچے کو گلابی تولیہ میں لپیٹا تھا اور مائی کا نواسہ فیروزی تولیہ میں لپٹا پڑا تھا۔

واہ! کیا میں اپنے بچے کو نہ پہچانوں گی؟ ٹھکرائن فیروزی تولیہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی تھیں اور ان کی گود کا بچہ بالکل باپ پر گیا تھا ہاں تھوڑی ماں پر تھی۔

لیکن ٹھاکر صاحب کو دونوں بچے گوشت کی بوٹی کی شکل کے معلوم ہو رہے تھے۔ ماتا جی کہتی تھیں ان کی گود والا بچہ ہی ان کا پوتا ہے کیونکہ اس کی طرف ان کا کلیجہ کھنچ رہا ہے۔

لیکن پھر سب چپ ہو گئے۔ رحمت مائی ستون سے لگی بیٹھی آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ مسجد سے لوگ بیٹی کا کفن دفن کرنے آئے ہوئے تھے وہ نواسے کو کیا پہچانتی' وہ تو خود کو بھولی ہوئی غم کے بوجھ سے دبی جوان بیٹی کی موت کا دھکا سہارنے میں جٹی ہوئی تھی۔

ٹھکرائن نے جب مائی کے نواسے کو دیکھا تو بھونچکی رہ گئیں نہ جانے کیا سٹر سوار ہوئی کہ رو رو کر ہلکان ہو گئیں۔ لوگ انہیں دھوکا کیوں دے رہے تھے۔ ٹھیک

کہتی ہیں ماتا جی' ان کی گود کا بچہ ہی ان کا پوت ہے' لیکن جب نرس ان کے پہلو سے بچہ اٹھانے لگی تو مچل اٹھیں۔

پھر سب بالکل بدحواس ہو گئے۔ ٹھکرائن کو فٹ پڑنے کا اندیشہ ہونے لگا۔ وہ دونوں بچوں کو سمیٹ کر اڑ گئیں کہ میرے تو جڑواں پیدا ہوئے ہیں تم لوگ طوفان جوڑ رہے تھے۔

دوسرے دن ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ سب سوچ رہے تھے کہ دن کی روشنی میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ اپنا بچہ بھلا چھپ سکتا ہے' خون کی کشش بھی کوئی چیز ہے۔ لیکن جیسے ہی ان کے پاس سے ایک بچہ اٹھایا جاتا وہ اپنا فیصلہ بدل دیتیں۔ ٹھکرائن کی ایسی حالت ہو گئی کہ بڑا ڈاکٹر بلوانا پڑا۔

اور سارے محلہ میں خبر پھیل گئی کہ بچے گڈمڈ ہو گئے اور محلے سے بات شہر تک پہنچی۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ' رحمت مائی حرافہ ہے' جان بوجھ کر ڈرامہ کھیلا گیا ہے تاکہ اس کا نواسہ عیش کرے اور بیچارہ ٹھاکر صاحب کا بچہ بھیک مانگے۔ گھور پاپ ہو جائے گا! ایک ہندو کا بچہ مسلمان کے گھر میں پلے گا سنسکرتی کو ٹھیس لگے گی' یہ ایک گروہ کے لوگوں کی رائے تھی۔

دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ ٹھاکر صاحب نے جان بوجھ کر گھپلا کیا ہے۔ اس طرح وہ ایک مسلمان بچے کو اپنے قبضہ میں کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

خوب بحثیں چلیں کئی محلوں میں تناؤ پھیل گیا ایک ہندو لڑکے نے ایک مسلمان کو تھپڑ مار دیا۔

بس جی دو چار چھریاں چلیں۔ خون خرابے ہونے لگے پولیس ناکوں پر ڈٹ گئی' بلوے پر قابو پا لیا گیا' بعد میں پتا چلا ہندو لڑکے نے جسے تھپڑ مارا تھا وہ مسلمان نہیں ہندو ہی تھا۔

سب جھوٹ! بلوے میں دلچسپی رکھنے والا گروہ بولا اور بلوہ بڑھتا گیا۔ دونوں فرقوں کے جلسے اور میٹنگیں ہونے لگیں۔ وفد افسر اعلیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فوراً سپرنٹنڈنٹ صاحب مع سارجنٹوں کے دوڑے آئے۔

"دونوں بچوں کو تصفیہ ہونے تک سرکاری ہسپتال میں بھیج دیجئے" "کیوں جی میں اپنا اکلوتا بچہ خیراتی ہسپتال میں کیوں بھیجوں؟ ٹھاکر صاحب اکڑ گئے۔

لیکن سوال یہ تھا ان کا بچہ کون سا ہے؟ ٹھکرائن نے رو رو کے برا حال کر رکھا تھا۔ کبھی ایک کو چھاتی سے لگاتیں' پھر دل دوسرے کی طرف کھنچنے لگتا' انہوں نے کہہ دیا ایک بھی بچے کو کسی نے ہاتھ لگایا تو وہ حشر کر دیں گی۔ پولیس میں ہمت ہے کہ بچہ کو لے جائے!

ظاہر ہے ایسے وقت میں ٹھکرائن سے ضد باندھنا انہیں قتل کرنے کے برابر تھا۔ ان کے دماغی توازن بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

ویسے سب ہی کا دماغی توازن ڈگمگا رہا تھا۔ خدا نے برسوں بعد ایک بچہ دیا اور وہ بھی اس کھٹائی میں پڑ گیا۔ اس کی وجہ سے خون خرابے ہو رہے ہیں۔ ٹھاکر صاحب حیران و پریشان تھے اور بے بس تھے۔

بچوں کو ذرا بڑا ہونے دیجئے' ہفتہ دو ہفتہ میں کچھ ناک نقشہ نکل آئے گا۔ پہچان پڑ جائیں گے" لوگوں نے رائے دی۔

رحمت مائی چوکھٹ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ مہربانی کر کے اس کا نواسہ دیدیا جائے تو وہ اپنے وطن پیلی بھیت لے جا کر کسی آنکھوں والی خدا ترس عورت کی گود میں ڈال دے۔ بے ماں باپ کا بچہ پل تو جائے گا' اب وہی دنیا میں اس کا سب کچھ تھا۔ اکلوتی بیٹی کی آخری نشانی!

اور جب بڑھیا کو حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی تو وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ مجبوراً" ٹھاکر صاحب نے کہا' دے دو کمبخت کو بچہ کہ پاپ کٹے!

سوال یہ تھا کون سا بچہ؟

"مجھ اندھی کو کچھ نہیں سوجھتا' تم آنکھوں والوں کے بھی دیدے پھوٹ گئے" رحمت مائی بڑبڑا رہی تھی "غریب بڑھیا کا ٹینٹوا دبانا ہے تو دوسری بات ہے"۔

بڑی جھک جھک کے بعد ایک بچے کے حق میں فیصلہ ہوا کہ وہ بڑھیا کا نواسہ ہے۔ لیکن اس میں ایکدم ماتا جی کو اپنے پتی یعنی بچے کے دادا کی شباہت نظر آنے

لگی- وہ چھاتی پیٹنے لگیں-

اب تو رحمت مائی کو یقین ہو گیا کہ یہ لوگ اسے جھانسہ دے رہے ہیں- وہ پھوٹ کر روئی کہ کلیجے ہل گئے-

ڈرتے ڈرتے پھر دوسرے کے حق میں فیصلہ کیا گیا- لیکن اسے لے کر رحمت مائی انگنائی تک مشکل سے گئی ہو گی کہ ٹھکرائن کے دانت بھنچ گئے' منہ سے جھاگ جانے لگے-

ذرا سوچو تو جسے بڑھیا لے جا رہی ہے' دراصل وہی ان کا پوت ہے- کوئی گارنٹ کر سکتا ہے کہ گتھی واقعی سلجھ گئی- فیصلہ ٹھیک ہوا ہے؟

بڑے سوچ بچار کے بعد ٹھاکر صاحب نے رحمت مائی کو سمجھایا-

"تم بچہ پال تو سکتیں نہیں کسی سے پلواؤ گی- مجھے پال لینے دو تم بھی جیسے رہتی تھیں رہو- تمہاری نظروں کے سامنے رہے گا" ٹھاکر صاحب جانتے تھے' بچے دونوں نظروں کے سامنے رہیں گے- لیکن ان کا بچہ تو کھو گیا- وہ اسے پورے یقین کے ساتھ نہیں دیکھ سکتے شک کیسے دور ہو گا- انہیں ایسا بھی کیا ہے بڑے ہو کر صاف پہچانے جائیں گے- عادتیں' خصلتیں کہاں چھپتی ہیں- رحمت مائی چپ چاپ سنتی رہی' پھر بولی-

صاف بات ہے ٹھاکر صاحب بچہ آپ کے ہاں پلے آپ کے دھرم پر چلے گا- یہ کیسے ہو سکتا ہے' حشر کے دن خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی کہ ایک مومن کا بچہ کافر بنا دیا- میری عاقبت خراب ہو جائے گی اور پھر بڑے مولوی صاحب تو جماعت باہر کرنے کو کہتے ہیں- میری تو جیتے جی مٹی پلید ہو جائے گی- خدا کا واسطہ میرا بچہ مجھے دے دو"-

"تمہارا بچہ میں دینا چاہوں تب بھی نہیں دے سکتا- ہاں اگر تم سوچتی ہو کہ تم اپنا نواسہ پہچان سکتی ہو تو میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں گا- میری مشکل بھی وہی ہے جو تمہاری' میرے اوپر بھی لوگ دباؤ ڈال رہے ہیں- سمجھتے ہیں میں جان بوجھ کر بن رہا ہوں' مسلمان بچہ ہڑپ کرنا چاہتا ہوں-

"اور مجھے کہہ رہے ہیں کہ آپ کی دولت کی لالچ میں جان کر میں نے یہ سارا سوانگ رچایا ہے، آپ کو بیوقوف بنا رہی ہوں"۔

لیکن شہر میں طوفان اٹھا ہوا تھا۔ اخباروں کے ذریعہ خبر پھیل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ آگ بھی پھیل رہی تھی۔

اسلام خطرے میں!

ہندو دھرم نشٹ ہو رہا ہے!

نعرے لگ رہے تھے۔ مذہبی پارٹیوں سے آگے بڑھ کر بات سیاسی پارٹیوں نے لپک لی تھی اور جلسے ہو رہے تھے۔ فنڈ جمع کئے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے پر گندگی اچھالی جا رہی تھی۔

"ملک کے ساتھ ناانصافی اور ظلم!"

"ملک کا بٹوارہ کافی نہیں، اب ہر گھر میں ایجنٹ چھوڑے جا رہے ہیں"۔

"نازیوں کی طرح بچے ملحد بنائے جا رہے ہیں"۔

"یہ سب نکسلائٹ کی کارستانی ہے"۔

"جمہوریت پر زبردست چوٹ!"

"اس میں چین کا ہاتھ ہے، ہمارے نظام کو درہم برہم کرنے کیلئے"۔

"سی آئی اے سبوتاج کر رہا ہے"۔

"گدی چھوڑو!"

اور پھر پارٹیوں میں اس سوال پر جوتے چل گئے۔ پھوٹ پڑنے لگی۔ منسٹریاں ڈگمگانے لگیں۔

ادھر کبھی لوگ رحمت مائی کو بھڑکاتے، اور وہ خدا کا قہر بن جاتی۔ نہ اچھی طرح سن نہ دیکھ پائے نہ ہاتھ پیروں پر قابو۔ ایک دم گالی گلوچ پر اتر آئی کہ بوکھلا کر ٹھاکر صاحب اسے ایک کے بجائے دونوں بچے دے دینے پر راضی ہو جاتے۔

لیکن جب وہ بھی مطمئن نہ ہو پاتی کہ اپنا نواسہ ہی مل رہا ہے تو غصہ اور جھنجھلاہٹ میں آ کر چوکھٹ پر ماتھا پھوڑنے لگتی۔

"اللہ رسول کا واسطہ میرا نواسہ مجھے دیدو!" وہ گھگھیاتی تو سب کے کلیجے موم ہو جاتے۔

ایسا بھی ہوتا لوگوں کا دھیان کسی دوسرے گرما گرم سانحہ کی طرف بٹا ہوا ہوتا اور وہ ہندو مسلم بچوں کے سوال کو بھول کر کسی اور سلسلے میں لڑنے جھگڑنے لگتے۔ تب رحمت مائی دعائیں پڑھ پڑھ کر دونوں بچوں پر پھونکتی' اللہ پاک سب حساب کتاب سمجھتا ہے۔ دعا یقیناً اس کے نواسے کے کھاتے میں ہی جمع ہو گی' انشاء اللہ کوئی خیانت نہ ہو گی۔

ٹھکرائن بھی سب بھول بھال کر سیدھی سادی ماں رہ جاتیں ان کے پیار کے پیاسے دل میں دو سے زیادہ بچوں کیلئے جگہ پڑی تھی۔

بس ماتا جی کی جان عجیب مصیبت میں تھی۔ ویسے وہ دونوں ہی بچوں پر اپنی جھجکتی ہوئی محبت نچھاور کرنے کو تیار تھیں' لیکن ابھی تک انہوں نے اپنے پوتے کو بھگوان کے چرنوں میں نہیں ڈالا تھا۔ کیسے ڈالتیں' کہاں تھا ان کا پوتا!

اور ٹھاکر نے کئی بار جیب سے روپیہ نکال کر ٹاس بھی کر دیکھا۔

لیکن دل کو سکون اور یقین نہ ملا۔ روپیہ کا کہا مان کر انہوں نے ایک بچہ مائی کو دے دیا۔ کیا معلوم وہی ان کا اپنا ہو؟ انہیں بلڈ ٹیسٹ پر بھروسہ تھا۔ خون کی جانچ پڑتال ہونے کے بعد ضرور معمہ حل ہو جائیگا۔ اس لئے بچوں کے ذرا بڑے ہونے کا انتظار تھا۔ اتنے چھوٹے بچوں کے خون ٹیسٹ کروانے کے خیال ہی سے ٹھکرائن طوفان اٹھانے لگتیں۔ ویسے سب انہیں کو مجرم کہتے تھے۔ ایسی بھی کیا ماں جو بچہ کو نہ پہچان پائے۔ گائے' بکری' کتیا' بلی تک پہچان لیتی ہیں۔ آپ ہی آپ ماں کو پتہ چل جاتا ہے لیکن ٹھکرائن اس بلا کی تھیں کہ جیسے مٹی کا تودا۔

پہلے تو ماتا جی نے بہو کو ڈانٹا پھٹکارا۔ لیکن جب وہ دھاروں دار روئیں اور قسمیں کھائیں کہ واقعی وہ خود بہت زور لگاتی ہیں لیکن پتہ ہی نہیں چلتا' اور نہ کوئی امید ہے کہ چل سکے گا بس ان دو میں سے ایک تو ان کا اپنا ہے ہی۔

ادھر شہر میں کچھ صوبائی الیکشن شروع ہو رہے تھے' مختلف گروہ ایک

دوسرے پر چھینٹے کس رہے تھے۔ ان دو بچوں کا سوال پھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب کوئی سجن اپنی کار گزاریوں کے بارے میں بھاشن دینے کو کھڑے ہوتے بچوں کے اس المیہ کو درمیان میں ضرور گھسیٹ آتے اور جو تباہ کریاں ان بچوں کے گڈمڈ ہو جانے سے شہر میں پھیل رہی تھی۔ وہ ان پر رائے زنی کرتے اور زور شور سے وعدہ کرتے کہ اگر وہ الیکشن میں جیت گئے تو اس طرح کے خوفناک گھپلے بالکل نہ ہونے پائیں گے۔ کیونکہ وہ اپنے فرقے کے حقوق کی کاطر اپنا خون پسینہ ایک کر دیں گے!

مخالفین بھی چوکنے والے نہ تھے۔ انہوں نے ٹھاکر صاحب کی قوم پرستی' اور دور بینی کو سراہا کر کس ہوشیاری سے انہوں نے مخالف فرقے کا بچہ ہنڈیا ڈالا۔ اگر ساری قوم میں ایسی ہی جاگرتی پھیل جائے تو ملک کے سارے دلد دور ہو جائیں گے۔

اس بیان پر مسلمانوں میں کہرام مچ گیا۔ اگر اسی طرح مسلم بچوں کا غبن ہوتا رہا تو بہت جلد اسلام کے نام لیوا ختم ہو جائیں گے۔ قومی رہنماؤں کے وفد پر وفد سرکار پر زور ڈالنے کیلئے جانے لگے۔ دونوں طرف سے جہاں کسی کی الیکشن مہم ٹھنڈے پڑنے لگتی' لوگ بھجن منڈلیوں اور توالیوں کے ہنگاموں کے باوجود جلسوں کی طرف سے بے توجہی برتتے تو فوراً کنڈیڈیٹ بچوں کے گھپلے کا سوال پیدا کر دیتے ایکدم لوگوں میں جان پڑ جاتی شد و مد سے جلسوں میں جانے لگتے۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ بچوں کا بلڈ ٹیسٹ کیا گیا۔ ساری رات ٹھکرائن کروٹیں بدلتی رہیں۔ رام جانے کون سا بچہ انہیں ملے گا۔ کون سا رحمت مائی لے جائے گی۔ ان کی برسوں کی ترسی ہوئی مامتا دونوں بچوں پر طوفان کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ بار بار اٹھ کر بچوں کو تکتی رہیں۔ دونوں گول مٹول ہو گئے تھے' دونوں کا رنگ گورا تھا' نقشہ منا منا ستھرا سا۔ ایک راجپوت تھا' دوسرا پٹھان! کبھی دونوں کے دادا پردادا ایک ہی پیڑ کے پتے رہے ہوں گے۔ تھوڑے اور بڑے ہو جائیں تو پتہ چلے

گا- ابھی تو بس چینی کے گڈے جیسے تھے' ساتھ ساتھ سوتے جاگتے' ساتھ ہی دودھ ملتا- اسلئے بالکل جڑواں بچوں کی طرح ایک ہی جیسے معلوم ہوتے' دونوں میں سے وہ ایک کو نہیں چن پا رہی تھیں-

ٹھاکر صاحب نے جب بلڈ ٹیسٹ کے معنی سمجھائے تو زمین آسمان ایک کر دیا-

"ہائے! میں اپنے لال کا لہو نکالنے دوں گی' ڈاکٹر سے کہو کہ نبض دیکھ کر جو فیصلہ ہو سو کر دیں"-

چھوٹی بڑی کون سی بیماری ہے جو ڈاکٹروں سے چھپی ہے دیر سویر سب ہی کی پکڑ ہو جاتی ہے- مگر کون مائی کا لال ہے جو نبض دیکھ کر مذہب یا عقیدہ پہچان جائے-

لیکن ٹھکرائن کے دماغ میں یہ بات ٹھونسنے کا کوئی راستہ نہ تھا- ڈاکٹروں نے بھی کہا کہ ضروری نہیں کہ صحیح فیصلہ ہو جائے- یہ ضروری نہیں کہ باپ بیٹے کا خون ایک گروپ کا ہو- ٹھکرائن گروپ سروپ کیا سمجھتیں' بس یہی کہے جاتی تھیں' جو ڈاکٹر نبض دیکھ کر نہ پہچان پائے' وہ پاکھنڈی ہے' جوتے مار کے نکال دو- وہ دونوں بچوں کو لے کر کنڈی چڑھا کر کمرے میں بیٹھ گئیں-

ان کے اس رویہ پر اور بھی رنگ برنگی افواہیں اڑنے لگیں-

"اصل میں ٹھکرائن کا بچہ ٹھاکر صاحب سے نہیں' کسی اور سے ہے' اس لئے وہ بلڈ ٹیسٹ سے کترا رہی ہیں"-

انسان خصلتا" آدم خور ہے' اب کھانا حرام ہو گیا ہے- تو منہ میں پانی بھرتا ہے- چڑ کر دکھ پہنچا کر ہی کلیجہ ٹھنڈا کر لیتا ہے- جسمانی توڑ پھوڑ اور کانٹ چھانٹ سے جی نہیں بھرتا- تو دل و دماغ میں برما کر کے تیزاب بھرنا چاہتا ہے- اس افواہ نے ٹھاکر صاحب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا- بیٹے کی خوشی تو مٹی میں مل ہی چکی تھی' اب دل میں ایک گندے شک نے ڈنک اٹھایا' سہم کر پاس پڑوس پر نظر ڈالی' ٹھکرائن کا یار کون ہے؟ جی چاہا اسی وقت تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں' پھر اپنے بھیجے میں

گوی مار لیں۔

ادھر رحمت مائی عاقبت کے بوریئے سمیٹنے پر تلی ہوئی تھی۔ بچے کے کام میں اذان دینے کیلئے مولوی لائی تھی تب ہی ماتا جی اور ٹھکرائن رام رام کہہ اٹھی تھیں' بری ردوقدح کے بعد یہ فیصلہ ہوا تھا کہ فی الحال دونوں کے کان میں اذان دلوا دی جائے۔ اللہ کا نام کان میں پڑنے سے کوئی نقصان نہیں۔ جب مولوی اذان دے کر سوا روپیہ فی بچہ کے حساب سے ڈھائی روپے لے کر چلتا بنا تو ماتا جی نے رحمت مائی کی ریں ریں کی پرواہ کئے بغیر بچوں پر گنگا جل چھڑکا اور آرتی اتار دی۔

اب رحمت مائی کو ہڑک اٹھ رہی تھی' بچہ کی مسلمانیاں ہو جائیں تو اچھا ہے' پھر بڑا ہو گیا تو تکلیف زیادہ ہو گی۔

لیکن ٹھکرائن بچوں کے متعلق کوئی بھی چھری چاقو والی بات نہیں سننا چاہتی تھیں۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر ان کے بچے کو ہاتھ لگایا تو رحمت مائی کی گردن کاٹ دیں گے۔

بچے تو بچ گئے۔ لیکن اس بات پر ہنگامہ ہوا۔ اور دو چار گردنیں کٹ گئیں۔ بات بڑھتی چلی گئی۔ کچھ منچلوں نے رحمت مائی کے کوٹھے کو آگ لگا دی اور وہ اپنا سامان سمیٹ کر کوٹھی میں لے آئی۔ مخالفین کیوں چپکے بیٹھتے۔ لوٹ مار تو کچھ لوگوں کی آمدنی کا واحد ذریعہ ہے۔ کام کی چیزیں لوٹ لیں' کوڑا جلا دیا۔

اس وقت دو ایک پارٹیوں میں زوروں کا جوتا چل رہا تھا۔ حکومت کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ لوگ ویسے ہی مہنگائی بے روزگاری اور گھروں کی قلت سے بھرے بیٹھے رہتے ہیں بات بات پر اسٹرائیک اور بند لگ جاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فساد شروع ہو جائیں۔ تو سارے بند اور اسٹرائیک بھول کر لوگ فرقہ پرستوں کو گالیاں دینے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جو غریب مجبور لوگ مارے جاتے ہیں تو کچھ آبادی کے مسئلہ پر بھی خوشگوار اثر پڑتا ہے۔
لیکن ان دو بچوں کے مسئلے نے بے حد گمبھیر صورت اختیار کر لی۔ رحمت مائی کا کوٹھا جلایا گیا۔ اس کے جواب میں ٹھاکر صاحب کی کوٹھی جلانے کی کوشش کی گئی۔

حالانکہ کوٹھا جس میں مائی رہتی تھی، ٹھاکر صاحب ہی کا تھا۔ لیکن انتقام میں عقل کون ضائع کرے۔

مسلمانوں کا ایک لمبا جلوس کوٹھی کے گرد آکر رکا۔ نعرے لگنے لگے۔ جواب میں فوراً دوسری طرف سے ہندوؤں کا مجمع آگیا۔ اور باقاعدہ مورچہ قائم ہو گیا۔ رحمت مائی بھولی بسری آئتیں پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگیں۔ اور ٹھکرائن نے بچوں کو گود میں لے لیا اور کوٹھے پر جا کر ڈٹ گئیں۔ زینہ پر ٹھاکر صاحب بندوق تان کر کھڑے ہو گئے۔ نوکر چاکر کھڑکیاں، دروازے بند کرنے لگے۔

باہر باقاعدہ دونوں مورچے ڈٹے ہوئے تھے۔

"رحمت مائی کو جبریہ قید سے آزاد کیا جائے اور اس کا نواسہ اس کے سپرد کیا جائے"۔

مسلمانوں کی مانگ تھی۔

"رحمت مائی، اور اس کے نواسہ کو ایک ٹھاکر کا گھر گندہ کرنے کے جرم کی سزا ملنی چاہئے----" ہندو کہہ رہے تھے۔

"رحمت مائی زندہ باد!"

"رحمت مائی مردہ باد!" اور رحمت مائی خوش قسمتی سے اونچا سنتی تھی۔ صرف وہ غل سن رہی تھی جو اس نے اپنے جوان داماد کی موت سے پہلے سنا تھا۔

باتوں کے بعد فریقین ایک دوسرے پر اینٹ پتھر پھینکنے لگے، پھر چاقو اور چھریاں نکل آئیں۔

ٹھاکر صاحب فون پر فون کر رہے تھے۔ دھڑا دھڑ انہوں نے ہوا میں چند فائر کئے، بلوائی ایک دم ہڑبڑا کر بھاگے۔

"سنو بھائیو! سنو!" ٹھاکر صاحب چلائے مجمع ٹھٹھک گیا۔ انہوں نے پورے مجمع پر ایک اڑتی ہوئی نظر ڈالی۔ لوگ آج کل ایسا لباس پہنتے ہیں کہ اندازہ لگانا مشکل ہوجاتا ہے کہ کون ہندو ہے، اور وہ کون مسلمان! زیادہ تر میلے کچیلے نیکر اور اوٹنگے پتلون پہنے ہوئے تھے۔

لوگ پھر چلانے لگے۔

رحمت مائی کو رہا کرو! بچہ واپس دو!!

"رحمت مائی ڈائن ہے! بچہ ملچھ ہے! نکالو دونوں کو" اچھا اچھا میں نے سن لیا۔ میں وعدہ کرتا ہوں' آپ لوگ کل صبح تشریف لایئے آپ لوگ جو فیصلہ کریں گے' آپ سب کے سامنے اس پر عمل کروں گا۔ ٹھیک؟"

تھوڑی دیر کھد بھد کھچڑی پکتی رہی۔ پھر لوگ اپنی رائے دینے لگے۔ وہ کیا کہنا چاہتے تھے' یہ ٹھاکر صاحب نہ سن پائے۔ کیونکہ اسی وقت پولیس کی جیپیں سنسناتی ہوئی آن پہنچیں۔ آتے ہی دنا دن فائرنگ ہونے لگی۔ جیسے بلوائیوں کو بلوہ کرنے کے بجائے بے دیانتی سے سمجھوتہ کرکے دیکھ کر پولیس چڑ گئی ہو۔ دم بھر میں میدان صاف ہو گیا۔ ٹھاکر صاحب نے تمام تفصیل بتائی' اور بروقت پہنچنے کا شکریہ ادا کیا۔

"ٹھاکر صاحب آپ آگ سے کھیل رہے ہیں' ختم کیجئے اس مذاق کو۔ رحمت مائی اور اس کے نواسہ کو ہم پولیس کی حفاظت میں لے جاتے ہیں-----"

ٹھاکر صاحب سر جھکائے سوچتے رہے۔ واقعی اب انہیں فیصلہ کرنا ہو گا' یوں کام نہ چلے گا۔

"امن عامہ میں خلل پڑ رہا ہے۔ یہ آگ بہت خطرناک صورت اختیار کر سکتی ہے!"

"جی میں سمجھ گیا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ جیسا آپ کہتے ہیں ویسا ہی ہو گا"۔

"تو پھر دیر نہ کیجئے!"

"آج اور رہنے دیجئے' رحمت مائی کی طبیعت بھی اچھی نہیں بچے سو رہے ہیں۔ جگایا تو کچی نیند میں ہلکان ہو جائیں گے۔ پھر ٹھکرائن کو بھی سمجھانا ہے"۔

"وہ سمجھ جائیں گی؟"

"کیوں نہ سمجھیں گی' ایک دن تو فیصلہ ہونا ہی ہے"۔

پولیس افسر کے جانے کے بعد وہ اندر نہیں گئے' باہر ہی ٹہلتے رہے' سارے لان پر پتھراؤ کی وجہ سے اینٹ پتھر پڑے تھے- وہ پیر بچا بچا کر چلتے رہے-

پھر وہ اندر گئے بچوں کے کمرہ میں زیرو پاور کا نیلا بلب جل رہا تھا- نیلا کمرہ' نیلے پردے' نیلی روشنی میں جیسے آکاش کا کوئی اچھوتا کونا تھا جہاں دو ننھے ننھے فرشتے میٹھی نیند سو رہے تھے- سفید بے بی بیڈ پر دونوں بچے اڑے سوئے ہوئے تھے- ٹھکرائن کئی دن سے تقاضہ کر رہی تھیں کہ بچوں کیلئے ایک اور بیڈ منگوایئے' بڑے ہو رہے ہیں' ایک دوسرے سے ہاتھ ماریں گے' وہ مسکرا پڑے-

ہندو مسلمان جو ٹھہرے' لات گھونسہ نہ چلائیں گے تو کھانا کیسے ہضم ہو گا"-

"غور سے وہ بچوں کو دیکھ رہے تھے جیسے پوچھ رہے ہیں"-

"تم کون ہو؟" جیسے بچے واقعی بول ہی پڑیں گے-

ٹھکرائن پہلے تو بہت بگڑیں- لیکن جب معلوم ہو گیا کہ کوئی اور چارہ نہیں تو دونوں کو ایک ایک گھٹنے پر ڈالے ساری رات بیٹھی سسکیاں بھرتی رہیں' صرف ایک رحمت مائی تھی جو پڑی خراٹے لیتی رہی جیسے اس کا نواسہ مل گیا ہو- باقی سب نے رات آنکھوں میں کاٹ دی-

صبح سب کے چہرے پیلے ہو رہے تھے- ٹھکرائن کی آنکھیں سوج رہی تھیں-

پھر فیصلے کا وقت آگیا- دربار سجا لوگ تماشہ دیکھنے میں جمع ہوئے- پولیس کا انتظام قابل تعریف تھا- ٹھاکر صاحب برآمدے میں بیٹھے تھے- ٹھکرائن نے دونوں کو نہلا کر پیار کیا- کرتے پہنائے- کاجل ڈال کر نظر کا ٹیکہ ماتھے اور پاؤں کے تلوے میں لگایا' پھر آنکھوں کے تل کھول دیئے-

"رحمت مائی اپنا نواسہ اٹھالو"-

"ایں؟" رحمت مائی کھانسی- "تم ہی دے دو بہو جی!"

"میں اپنے ہاتھ سے ان کا میلا پوتڑا بھی نہ دوں گی!" راجپوتنی غرائی-

"جلدی کرو مائی' باہر لوگ انتظار کر رہے ہیں"-

"انتظار کر رہے ہیں تو کرنے دو' خدا کی مار ان کی صورتوں پر!" اطمینان سے وہ کراہی- گھٹنے چٹخاتی منہ ہی منہ میں کسی کو کوستی اٹھے- ایک بچہ اٹھایا اور باہر چلی-

"اے مائی سنو تو!"

"کاہے کو؟" وہ ٹرائی-

"پہچان لیا؟" ٹھکرائن نے مری آواز میں پوچھا-

"ہاں' ہاں' کیوں نہ پہچانوں گی- میرا نواسہ ہوا نا"- وہ لپک کر باہر چلی گئی- ٹھکرائن کا دل ساتھ کھنچا چلا گیا انہوں نے بے بی بیڈ میں لیٹے بچے کو دیکھا! جیسے وہ کوئی اجنبی ہو- آج پہلی بار ملاقات ہوئی ہو انہوں نے اسے گود میں لے لیا- لیکن گود خالی ہی رہی-

باہر جا کر رحمت مائی نے مجمع کو بتایا کہ شکر خدا کا کہ اس کا نواسہ مل گیا- سب خوش خوش چلے گئے' فخر سے جاتے ہوئے مجمع کو دیکھا پھر گود کے بچے کو دیکھا' اور سیڑھیوں پر اترتے اترتے رک گئی- کچھ دیر چندھی آنکھوں سے دیکھتی رہی' پھر ایسے پلٹی جیسے کوئی چیز بھول آئی ہو-

"نا بھو جی! میں اس نگوڑے کو نہ پہچانتی"-

مائی نے بچہ ٹھکرائن کی گود میں ڈال دیا-

خدمت گار
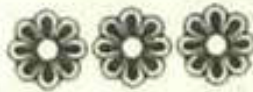
کتنی دفعہ تم سے کہا ہے کہ بھئی جلدی لایا کرو۔ مگر سنتے ہی نہیں!"میں نے پچھلی سیٹ پر کتابیں پٹخ کر کہا۔" ڈیڑھ گھنٹے سے پاگلوں کی طرح ٹہل رہی ہوں۔ غضب خدا کا ڈھائی بج رہے ہیں۔ خدا کی قسم آج ابا سے ضرور کہوں گی کہ بہادر سے وقت پر موٹر نہیں لائی جاتی تو میرے لئے دوسرا انتظام کریں"۔ اور میں کتابیں سرکا کر بیٹھ گئی۔

تو سرکار ناراض کیوں ہوتی ہیں۔ کل ذرا جلدی لایا تو فرمایا "اتنی جلدی لے آتا ہے۔ میں لائبریری میں پڑھ بھی نہیں پاتی" بہادر نے بدتمیزی سے میری نقل کرتے ہوئے کہا۔

"چپ رہو' ایک تو غلطی کرتے ہو اور اوپر سے ٹراتے ہو" میں نے جھڑک کر کہا۔

"اتنا غصہ کریں گی تو سوکھ کر کانٹا ہو جائیں گی" بہادر نے تنبیہاً انگلی ہلا کر کہا۔

"دیکھو بہادر! بک بک مت کرو" میں نے غصے کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔

"تو پھر آپ بھی---- تو پھر آپ غصہ کیوں ہوتی ہیں' ایسا برا منہ لگتا ہے"

"تمہاری بلا سے"

"تمہاری بلا سے" اس نے اترا کر نقل اتاری۔

مجھے ہنسی آنے لگی۔

"آج تو مارے غصے کے پیچھے جا بیٹھیں۔ آگے آیئے نا" اس نے کھڑکی کھول کر حکم دیا۔

"نہیں، چلو، بک بک نہ کرو۔ جہاں میرا دل چاہے گا بیٹھوں گی۔"

"اچھا تو پھر چلا لیجئے خود، ہم سے نہیں چلتی" اس نے نہایت لاپرواہی سے کھڑکی سے سہارا لے کر کہا۔

"بہادر شاید تم بھول رہے ہو کہ تم نوکر ہو" میں آج لڑنے پر تلی ہوئی تھی۔

"تو لیجئے میں استعفیٰ دیتا ہوں، بس!" وہ موٹر سے ہٹ کر زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور لاپروائی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"بہادر بدمزاقی مت کرو، مجھے واقعی غصہ آرہا ہے" میں نے جھلا کر کہا

"واقعی!" اس نے ہنس کر مذاق اڑایا۔

"بہادر سیدھی طرح موٹر چلاتے ہو کہ ---"

"تو پھر آگے آیئے نا۔ اچھا قصور ہوا لیجئے پیر چھوتا ہوں۔ آپ کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر سچ میرے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور موٹر الٹ جاتی ہے اور ----"

"نہیں آج میں پیچھے ہی بیٹھوں گی" میں نے صلح پر رضامند ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں آپ آج آگے ہی بیٹھیں گی۔ اب معافی جو مانگ لی ہے"۔ اس نے خوشامد سے کہا۔

میں اتر کر آگے بیٹھ گئی۔

"اگر آپ آگے نہ بیٹھتیں تو میں موٹر تھوڑی چلاتا" وہ شرارت سے مسکرایا

"بہت بے حیا ہو" میں نے کہا۔

"کون؟" اس نے ایسے کہا گویا وہ خود مجھے بے حیا سمجھتا ہے۔

"بدتمیز، میں آج ضرور ابا سے کہوں گی کہ تم کبھی وقت پر نہیں آتے" میں نے اپنی ہنسی روکنے اور بات ٹالنے کے لئے کہا۔

"تو پھر خود ہی موٹر چلانا سیکھ لیجئے نا"۔ یوں آتی ہے یوں" اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

"سیکھوں ہی گی" میں نے توجہی سے فیصلہ کیا۔

"تو پھر سیکھئے نا- آج ہی سے شروع کیجئے چلو جبلی پارک" اس نے موٹر موڑ کر کہا-

"کیا واقعی دو روز میں سکھا دو گے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا

"اور کیا- دیر ہی کتی لگتی ہے- مگر یوں تھوڑی---- او ہنہک--- پہلے سیر بھر مٹھائی" اس نے ہونٹ بھینچ کر سر ہلاتے ہوئے کہا-

"مٹھائی وٹھائی کا جھول ہے- یونہی سکھاؤ"

"خوب! بھئی واہ تو پھر سکھانا بھی جھول ہے- اچھا سودا ہے- ایسی مفت کی موٹر کسی اور سے سیکھئے" اس نے اکڑ کر کہا-

"اچھا اب اتراؤ نہیں ورنہ ابا سے کہہ دوں گی- وہ جوتے لگیں گے کہ یاد ہی کرو گے" میں نے دھمکی دی-

"اچھا یہ ہے تو پھر یہ ہی سہی' جایئے کر دیجئے- سو دفعہ شکایت- نہیں سکھاتے"

"تو اتنا اکڑتا کیوں ہے اچھا چل مل جائے گی مٹھائی سکھاؤ تو" میں نے وہیل پر ہاتھ رکھ کر کہا-

"تو پھر---- خیر---- سنئے تو---- ذرا وعدہ کچھ ویسا ہے" اس نے بے اعتباری سے کہا-

"بدتمیز' تجھے میرا اعتبار نہیں"

"اور جو نہیں' پھر!"

"دیکھو کدھر گھماؤں" میں نے بات ٹالنے کے لئے وہیل پکڑ کر کہا-

"سیدھی طرف"

"ارے رے رے" میرے منہ سے نکلا اور موٹر بال بال تار کے کھمبے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی-

سیدھی سڑک پر جا رہی ہیں اور موڑنے کی کیسی جلدی ہے" اس نے مذاق اڑایا-

"اچھا لیجئے سنبھالئے" اس نے الگ ہو کر کہا- میرے ہاتھ کانپنے لگے- موٹر کی سپیڈ بڑھی اور ہوا سائیں سائیں کر کے میرے دل میں اترنے لگی-

"بہادر- ارے" میں نے تکلف سے کہا "ارے پکڑو"

آپ ہی پکڑیئے---- ہاں زور سے---- ارے بھاگی" اور وہ زور سے ہنسا-

موٹر کی سپیڈ بڑھی اور میں گھبراہٹ میں چلانے پر مجبور ہوئی اور ایک زور کا جھٹکا لگا- موٹر الٹتے الٹتے بچی- بہادر نے ایک دم بریک دبا دیا تھا میں نے ہاتھ ہٹا لئے اور واقعی غصہ ہو کر بیٹھ گئی- مجھے پسینہ آگیا تھا-

"اچھا لیجئے---- لیجئے اب کے نہیں" اس نے خوشامد سے کہا

"چلو گھر سیدھے" میں نے غصہ سے حکم دیا-

"اب چلایئے نا- اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی- ہونہہ---- اسی برتے پر موٹر چلائیں گی" اس نے موٹر گھر کی طرف موڑ کر کہا-

"اور چلائیں کیسے؟ جیسے لوٹ ہی تو گئی نا' بہت چلی آپ سے موٹر!"

بہادر ہنستا رہا اور میں اتر کر کھسیانی اندر چلی گئی-

"ارے بندو!" بہادر نے مالی کو پکار کر کہا "بیوی کو موٹر چلانی آگئی" اور وہ طویل قہقہ لگا کر موٹر گیراج میں لے گیا-

ذرا سوچئے ایک ذلیل نوکر جو چھوٹی عمر سے ہمارے ہاں رہا- دن بھر پٹتا' برتن مانجھتا' جوتے صاف کرتا- ذرا بڑے ہو کر چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ڈرائیور کی خدمت انجام دیتا- اور یہ دماغ؟ وجہ یہ ہے کہ مجھے اور بھیا کو سوائے بہادر کے کبھی کوئی دوست نصیب نہ ہوا چنانچہ ہم نے ہمیشہ اس کے لاڈ برداشت کئے- بھیا تو جلد ہی سکول میں بورڈ ہوگئے اور بہادر نے مجھ پر رعب جمانا شروع کیا- ہر بات میں اس ہی کی ور رہتی- روٹھ جاتا تو ایک بات کرنے والا ہی ہاتھ سے جاتا- ابا دوسرے اباؤں کی طرح ہم سے کبھی لاڈ پیار نہ کرتے تھے- ویسے بہادر کو خود انہوں نے سر چڑھا رکھا تھا- کبھی میں نے اگر شکایت بھی کی تو ہنس کر ٹال دیا- بچپن میں تو اگر

کبھی میں بھولے سے بہادر کو ماردیتی تو وہ تڑاق سے چانٹا مارتا کہ منہ پھر جاتا۔ ابا کو فخر تھا وہ مجھ کو ڈانٹتے کہ "تو پہلے کیوں مارتی ہے"۔ ویسے بہادر کا جب جی چاہتا مجھے چھپ چھپ کر خوب ٹھونکتا۔ بھیا سے بھی وہ برابر ہی کا برتاؤ کرتا۔ اب تک جب وہ کالج سے آتے ہیں تو دونوں میں گھل مل کر باتیں ہوتی ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ آقا اور نوکر ہیں۔

موٹر سیکھتے دنوں کی بجائے ہفتے ہوگئے۔ سوائے لڑنے اور صبر کرنے کے موٹر سیکھتے وقت اور کچھ نہ ہوتا۔ کبھی سوچتی بھاڑ میں جائے' تانگے میں کالج چلی جایا کروں گی۔ موٹر نہ ہوئی مصیبت ہوگئی۔ مگر پھر بہادر سبز باغ دکھاتا اور میں چکر میں آکر سیکھنے کو تیار ہوجاتی۔

بہادر کو ہر بات میں دخل دینے کا حق ہے۔ پڑھے نہ لکھے ٹوٹی پھوٹی اردو آتی ہے۔ اس پر یہ زور کہ اردو کا اخبار گھر میں آنا لازمی۔ جہاں میں اور ابا اپنی سنجیدہ بحث شروع کرتے بہادر اپنی بدتمیز رائیں پاس کرنا شروع کردیتا میری بات کو کاٹتا اور میں جل جاتی۔ مگر ابا کہتے "یہ خوب سیاسیات کو سمجھتا ہے اسے الو نہ سمجھو۔"

بڑی ہنسی آتی۔ جب بہادر صاحب مولا بہشتی' ننھا دھوبی اور ننو چمار کے لڑکے اور مسجد کے مولوی صاحب کے بیچ میں ٹوٹی ہوئی اینٹ پر بیٹھ کر چین اور جاپان' جرمنی اور آسٹریا کے موجودہ تعلقات پر رائے زنی فرماتے' اوٹ پٹانگ' جھوٹ سچ واقعات پر روشنی ڈالی جاتی۔ ننوا نوجوان لڑکا خودکشی اور فراری کے واقعات جو اسے ازبریاد ہوتے تھے۔ نہایت جوشیلی آواز میں سناتا۔ مولا کو ہمیشہ ہندو مسلمانوں کی باہمی جنگوں کا ذکر سننے میں مزہ آتا۔ اس کا بس نہ تھا کہ ہندوؤں کو پیس ڈالے۔ ننوا گو ہندو تھا مگر اسے فسادوں سے دلچسپی نہ تھی۔ دوسرا وہ مولا کے تگڑے تگڑے بازو دیکھ کر ذرا خوش مزاج ہی رہنا پسند کرتا تھا۔

ایک دن میں اخبار پڑھ رہی تھی کہ بہادر کمرہ صاف کرنے آئے۔ اخبار کو جھانک جھانک کر دیکھنا ان کی عادت ہے۔ ان کے "پھٹے" ہوئے اخبار میں تصویریں نہیں ہوتیں اور اس وجہ سے انہیں میرے اخبار میں جھانکنے کے لئے نرم ہونا پڑتا

ہے۔

"یہ کون ہے؟" وہ ایک تصویر دیکھ کر بولے
"یہ ایک لیڈر ہیں" مین نیکی کے دم میں تھی۔
"لیڈر!" یہ لفظ ان کے اخبار میں کم آتا تھا "لیڈر"
"ہاں" میں نے مختصر طور پر کہا
بہادر کی غرض اٹکی تھی مجھے معلوم ہوگیا
"تو یہ لیڈر کون ہوتے ہیں یہ تو جانور لگتا ہے"
"چپ بد تمیز۔ یہ بہت بڑا آدمی ہے"
"کوئی پانچ چھ گز کا؟"
"بے وقوف ہو تم"
"ویسے ہی تو نہیں جیسے لیڈر صاحب یہاں آتے ہیں"
"کون؟"
"وہی جو پرسوں بھی آئے تھے"
"وہ پلیڈر تھے بے وقوف یہ لیڈر ہے"
"اچھا" اس نے بالکل نہ سمجھ کر کہا
"یہ رہنما ہے"
"یہ۔۔۔۔ رہنما۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔ قطب نما" وہ اترانے لگا
"تو تم اسے نہیں جانتے؟"
"نہیں"
"تمہارے اخبار میں کچھ نہیں لکھا"۔
"اس میں ایسے بیہودہ لوگوں کا کہاں ذکر۔ دو تو ورقے ہوتے ہیں سارے اخبار میں۔ زیادہ تر تو بس غزلیں ہی ہوتی ہیں اور آتا بھی بہت دنوں میں ہے"
"کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے جاہل اپنے لیڈر کو نہیں جانتے" میں نے تاسف سے کہا

"تو اس میں میرا کیا قصور! مجھے تو فرصت ہی نہیں ملتی جوان "نما" صاحب کے پاس جاؤں۔ چوراہے تک تو جانے کی مہلت نہیں ملتی"

"تم جیسے اس کے پاس جا بھی بہت سکتے ہو" میں نے ہنس کر کہا

"کیوں، کیا وہ سات تالوں میں رہتا ہے یا کیا؟"

"جی وہ تم جیسے ٹٹ پونجیے سے ضرور ملے گا"

"ہم ٹٹ پونجیے کاہے سے ہیں۔ یہ دیکھئے" بہادر نے ذرا سیدھے کھڑے ہو کر کہا۔

"وہ بہت بڑا آدمی ہے دور سے دیکھ لینا ہی اسے غنیمت ہے۔ تمہاری تو وہاں تک رسائی بھی نہ ہو گی"

"ایسے اس میں کون لڈو لگے ہیں جو ہم کھا جائیں گے۔ دماغ کیوں دکھاتے ہیں، کیا بہت روپیہ پیسہ ہے؟"

"بہت، دوسرے انہیں روپے کی پروا نہیں۔ کھدر پہنتے ہیں"

"تو اس میں کیا ہوا۔ ننوا چمار ہمیشہ سے کھادی پہنتا ہے۔ مولا بھی ایک تہبند میں چھ مہینے گزار دیتا ہے۔ ہم بھی سرکار اور بھیا کی اترن پہنتے ہیں"

"تم ننوا اور مولا تینوں گدھے ہو۔ یہ تو پوری قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ غریبوں کا انہیں بڑا درد ہے"

"ارے! اور ہم کون خدمت نہیں کرتے صبح سے جو جُت جاتے ہیں تو شام کو کہیں دس بجے چھٹی ملتی ہے۔ مولا کی کمر پانی بھرتے بھرتے ٹیڑھی پڑ گئی۔ ننوا کے ہاتھ چمڑا چھیلتے چھیلتے گھنا گئے۔ اب اور کون سی خدمت یہ لیڈر کرتے ہیں؟"

"جی تو جناب کا کیا خیال ہے کہ ننوا، مولا اور آپ تینوں لیڈر ہیں۔ ضرور!" میں نے ہنس کر مذاق اڑایا۔ تم لوگ گائے بیل کی طرح کام کرتے ہو۔ گدی سے تو کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ قوم کی خاطر قید میں جاتے ہیں۔ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں ان کی بھلائی کے لئے کوئی اگر جان مانگے تو جان تک دے دیں"۔

"تو کوئی مولوی ہیں، رشی ہیں، کیا ہیں؟"

"ہٹ رشی اور مولوی سب ڈھونگ مچاتے ہیں- یہ تو رہنما ہیں"

"ارے کچھ بتایئے تو یہ کون ہوتے ہیں- جیسے؟"

"جیسے وہ جو--- تجھے یاد ہے؟ لکھنؤ میں جلوس نکلا تھا"

"وہ لاٹ صاحب کا؟"

"ارے ہٹ--- وہ جو امین آباد----"

"وہ جو پپا شاہ جی نے پنکھا چڑھایا تھا درگاہ پر؟"

"میں تھپڑ ماروں گی جو ٹیں کرے جائے گا- جا نہیں بتاتے"

"تو پھر بتاتی نہیں ہیں ڈانٹے جاتی ہیں"

"ارے جب وہ قومی جھنڈیاں لگی تھیں---"

"وہی تو لاٹ صاحب والا تھا- سارے میں روشنی ہی روشنی تھی- ایسی رونق لگی تھی کہ کیا کہنا- منوں پھول لوگوں نے ڈالے تھے"

"نہیں ان کمبخت انگریزوں نے تو ہمارے ملک کو لوٹ لوٹ کر ناس کردیا- غریبوں کا پیٹ کاٹ کر استقبال کیلئے روپیہ جمع ہوتا ہے اور دو چار عمدہ عمدہ سڑکیں صاف کر کے اور سجا کے ان میں سے انہیں گزروا دیا جاتا ہے- بڑے ہمارے ملک پر حکومت کرتے ہیں- کم بخت کہیں کے" میں نے جوش سے کہا-

"اور یہ لیڈر کیا کرتے ہیں- یہ بھی تو جھنڈیاں لگا کر سڑکیں جھڑوا کر، اور ہار پھول پہن کر جلوس نکال دیتے ہیں بہت ہوا تو کچھ بول دیئے- دے تالیاں پڑی پٹ رہی ہیں سمجھ میں خاک نہیں آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں"

"تم بے وقوفوں کی سمجھ میں کیا آئے گا"

"تو پھر آپ جیسے----" وہ ہنسا- "تو پھر یہ، بے وقوف لوگوں کے لیڈر نہیں؟"

"نہیں اور نہ بدتہذیب لوگوں کے" میں نے جل کر کہا

"تو پھر ہمیں کیا ضرورت جو ہم انہیں کوڑی بھر بھی دھاریں بھئی ہمارا بھی

کوئی لیڈر ہوتا"

"تم تو سمجھتے ہی نہیں"

"تو پھر سمجھایئے نا" اس نے عاجز ہو کر کہا

"یہ لیڈر غریبوں کے ہمدرد ہیں۔ تمہارے پپا شاہ اور مداری شاہ تو ٹھگ ہیں۔ لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھرتے ہیں اور یہ تو غریبوں کی روزی کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے حقوق دلاتے ہیں"

پپا شاہ کے یہاں بھی تو آئے دن لنگر بٹتا ہے" بہادر نے دلیل پیش کی۔

"لو پیٹ بھرے کیوں پہنچ جاتے ہیں۔ اب میں نہ پہنچ جاؤں، آپ نہ چلی جائیں" بہادر بولا

"تم سمجھ ہی نہیں سکتے" میں نے عاجز آکر کہا

"اور جو کہتا ہوں سمجھایئے تو سنتی ہی نہیں"

"کیا سمجھاؤں، کوڑھ مغز! بھئی یہ ہمارے حقوق دلوا رہے ہیں۔ ہمیں گورنمنٹ کی نوکریاں دلوائیں گے۔ ہمارے لئے سیٹیں ریزرو کرائیں گے" میں نے سمجھا ہی دیا۔

"سیٹیں کیسی؟ ریل کی؟" کندہ ناتراش بولا

"اونہہ! گھٹل۔ بھئی ہٹ۔ میں تجھے نہیں سمجھا سکتی۔ ارے بھئی سیٹیں۔ اونہہ کیسے بتاؤں۔ اسمبلی میں سیٹیں"۔

"اچھا۔ اب میں سمجھا۔ بہادر نے سمجھنے کی کوشش چھوڑتے ہوئے کہا، "اچھا تو سب کو ڈپٹی کلکٹریاں ملا کریں گی"

"اور کیا"

"تب تو مزہ ہے۔ میں بھی ڈپٹی کلکٹری میں نام ڈلواؤں گا"

"جوتے لگیں گے" میں نے ہنس کر کہا

"جی۔ ای۔ بہت جوتے لگے اور ہاں ننوا کا لڑکا نویں درجے میں پڑھتا ہے وہ تو ضرور ہی ڈپٹی بن جائے گا"

تم، تمہارے ننوا اور مولا ہی تو ڈپٹی بننے کے لائق ہیں- ذرا سی گرہ میں بھی رکھتے ہو- ڈپٹی بنو گے"-

"کیوں، اس میں کیا ہے- تھانہ داری تو میں ایسی کروں کہ کیا بتایئے"

"بھلا تم، جو نہ جانے دھنے ہو کر جلاہے اور ننوا چمار مجسٹریٹ بنیں گے"

"اچھا تو پھر ہم لوگوں کا ذکر نہیں اور یہ گاندھی جی جو ہمارے ہیں وہ؟"

"وہ کیا کر سکتے ہیں مجبور ہیں- بھلا کیسے ایک رذیل آدمی کو اونچے عہدے دے دیئے جائیں- تم ہی سوچو بہادر!

"تو پھر کیا؟" پھر یہ نوکریاں بھی صرف بڑے لوگوں کے لئے ہی لے رہے ہیں- لو بھئی ابھی روٹی کپڑے کا ٹھکانہ بھی نہیں ہوا اور نوکریاں بھی نہ ملیں تو یہ کیسے لیڈر- ان سے اچھے مداری شاہ ہیں جو کھانا کپڑا دیں اور پھر ان کا کہنا کرلو تو جنت میں الگ جاؤ" بہادر نے جلی ہوئی آواز میں کہا-

"بس کھانا کپڑا ہی تو ضروریات نہیں- ان ذلیل خواہشات سے بلند و اعلیٰ اور بھی تو خواہشیں ہیں- یہ ضرورتیں تو صرف حیوانات کو ہیں کہ پیٹ بھر لیا اور بھٹے میں سو گئے"-

"واہ آپ بھی کیا کہہ رہی ہیں- اے جب پیٹ بھر کے کھانا نہ ملے گا تو کوئی جئے گا کیونکر- جانوروں کے چرنے کے لئے گھاس تو ہے اور سونے کو بھٹے تو ہیں- بہت سے غریبوں کو تو یہ بھی میسر نہیں- جانوروں کو ایک ایک کے در پر بھیک تو مانگنا نہیں پڑتی"-

میں کھسیانی ہوئی جا رہی تھی- یہ بہادر بڑا حجتی ہے ایک بات کے پیچھے پڑ جاتا ہے-

"غریبوں کی زندگی بہت اچھی ہوتی ہے" میں نے فلاسفی چھانٹی- نہ کسی بات کا غم نہ کر- مزے سے کھلی ہوا میں جھونپڑوں میں رہتے ہیں روکھی سوکھی ملتی ہے- مگر چین سے- کپڑے کی فکر بھی نہیں ستاتی"

"بڑی اچھی ہے غریبوں کی زندگی- آپ کو کیا معلوم- ان کو یہ روکھی سوکھی

بھی ان مصیبتوں اور فکروں کے بعد ملتی ہے۔ زمیندار کا جوتا سر پر رہتا ہے۔ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ بھئی خوب کھلی ہوا میں مزے سے رہے۔ ذرا آپ تو دو روز مزے اٹھا کر دیکھیں آنکھیں کھل جائیں۔ آپ سمجھتی ہوں گی جھونپڑی بھی کوئی سرکار کا دورے والا ڈیرہ ہے کہ اندر مزے سے میز کرسی جمی ہوئی ہے اور نوکر لگے ہوئے ہیں۔ جھونپڑی میں بھلا بھل تو پانی بھرتا ہے اور دنیا بھر کے کیڑے مکوڑے کا ڈر۔ اس پر نہ بستر نہ تکیہ۔ خوب!" بہادر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میری عادت ہے کہ بہادر کی دلیلوں سے خواہ کتنی ہی قائل ہو جاؤں۔ مگر کہتی اپنی ہی رہتی ہوں۔ میں نے بات ٹالنے کے لئے کہا "تم تو ہو جاہل لٹھ تم سے کون مغز مارے۔ پڑھو لکھو تو دنیا میں قدر بڑھے"۔

"تو پھر آپ پڑھاتی کیوں نہیں" اس نے ضد کی "دیکھئے پھر میری بھی قدر بڑھ جائے گی"۔

اس دن کی بحث اس بات پر ختم ہوئی کہ اگر بہادر ایمانداری سے مجھے موٹر چلانا سکھائے گا تو میں اس کو پڑھاؤں گی۔

ابھی چند روز ہی پڑھتے شروع ہوئے تھے کہ بہادر کو اپنی قدر بڑھ جانے کا گمان پیدا ہوگیا۔ بجائے نیچے بیٹھنے کے کھانے کے کمرے سے کرسی لاکر بیٹھ گئے اور کتاب کے ورق نہایت انہماک سے الٹنے لگے۔

"اٹھو یہاں سے میں نے اس کا کان پکڑ کر کہا۔

"کیوں؟ کیا کرسی پر بیٹھنا برا ہے؟" اس نے آنکھیں پھاڑ کر کان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اور میں کرسی پر دراز ہوگئی۔

"اٹھو یہاں سے" بہادر نے آہستہ سے میرے کان چھو کر کہا۔

میں نے اس کے ایک تھپڑ لگایا "بدتمیز"

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کرسی پر بیٹھنا بری بات ہے۔ لے کے ایسے زور سے میرے کان مروڑے۔"

"تم نوکر ہو اور پھر کرسی پر چڑھ کر بیٹھتے ہو"۔

"تو کیوں کیا نوکروں کے کان چمڑے کے ہوتے ہیں۔ بڑی آپ تو گاندھی جی کی چیلی بنتی ہیں۔ اللہ قسم اب تک کان درد ہو رہا ہے"۔

"تو کیوں گدھا پن کرتے ہو تم"

"کیا کیا میں نے؟"

"تم پھر اتنے گندے کیوں رہتے ہو۔ ذرا اپنے ہاتھ تو دیکھو جیسے بیل کے کھر" میں نے بات پلٹی۔

"کیا کروں۔ ساری عمر برتن مانجھتے، جوتوں پر پالش کرتے گزری۔ یہ دیکھئے کیسے گٹے پڑ گئے ہیں۔ اب موٹر کا کام کچھ کم گندہ ہے؟"

"تمہاری روح ہی گندی ہے"۔ میں نے فیصلہ کیا کپڑے دیکھو جیسے صافی!"

"اتنے سے روپے۔ اماں، بہن اور اس کے پانچ بچے۔ اتنے کپڑے کہاں سے بناؤں"۔

"اور یہ جو بال جھبرے کتوں کی طرح آنکھوں پر پڑے ہیں، یہ!" میں نے اس کے سر کے مائل سنہری بالوں کو پکڑ کر ہلایا۔

"اور جو مانگ پٹی کروں تو سرکار جوتے مار کر نکال دیں۔ جو سر منڈواؤں تو بھیا وہ ٹیپیں لگائیں کہ بھیجا نکل پڑے۔ دوسرا ایسی فکریں لگی رہتی ہیں کہ جی نہیں چاہتا" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تم پڑھو گے بھی یا میرا سر ہی کھائے جاؤ گے؟" وہ خاموشی سے پڑھنے بیٹھ گیا۔

رشید ابا کے بے تکلف ہم عمر دوستوں میں سے تھے۔ مجھ سے انہیں بچپن سے بے حد لگاؤ تھا۔ میں انہیں رشید چچا کہا کرتی تھی۔ وہ مجھے بہت چھیڑا کرتے تھے۔ وہ بڑے زندہ دل اور خوش طبیعت انسان تھے۔ مجھے دق بھی کرتے تھے۔ لیکن میری ذرا سی بات بھی وہ بڑی مسرت اور غرور سے مانتے تھے ان کی زندگی ہمیشہ ایک

مجرد ہی جیسی گزری- والدین نے بچپن میں زبردستی شادی کردی دو تین بچے ہوئے اور پھر جو بیوی سے علیحدگی ہوگی تو ملاپ ناممکن ہوگیا- رشتہ داروں سے دور ہم لوگوں کے سوائے کوئی ہمدرد غریب کا نہ تھا بھیا کو اور مجھے بہت ہی چاہتے تھے- مجھے بھی وہ بہت ہی اچھے لگتے تھے- ابا تو کبھی لاڈ پیار کرتے نہیں تھے- رشید کی محبت ایک نعمت معلوم ہوتی تھی- وہ چند روز کے لئے آیا جایا کرتے تھے تو ان کے آنسو آجایا کرتے تھے- انہیں آئے ہوئے کئی روز ہوگئے تھے- انہیں مجھ سے بہت سی باتیں کرنا تھیں اور بجائے گھر میں بیٹھنے کے کہیں باہر کار میں جائیں- صبح ہی صبح جو بہادر میرے کمرے میں آیا تو میں نے پوچھا "رشید کہاں ہیں؟"

بہادر نے شرارت سے اپنی جیب میں جھانکا- پھر دوسری میں ہاتھ ڈالا- پھر حسرت سے منہ بنا کر ہاتھ اور سر ہلایا- گویا کہتا ہے "نہیں ملتے، کھو گئے"

"بتاؤ کہاں گئے ہیں؟" میں نے ہنسی کو روکنے کے لئے کہا-

"پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ ہمیں آج کل پڑھاتی کیوں نہیں ہیں؟" بہادر نے کمر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا-

"نہیں پڑھاتی- پہلے بتاؤ"

"نہیں بتاتے، پہلے پڑھاؤ" اس نے فورا" کہا-

اس کی کمینی عادت سے واقف ہوں اس لئے نرمی سے کہا "پڑھا دوں گی- بھئی آج میرا دل نہیں چاہتا"

"تو پھر میں بتا دوں گا- آج میرا دل نہیں چاہتا"- اس نے "میرا" پر زور دیتے ہوئے کہا اور جانے لگا-

"ٹھہرو بہادر" وہ مڑ گیا-

"بات یہ ہے---- بھئی مجھے---- میرے سر میں درد ہے- اس لئے آج تو نہیں ہاں کل پڑھاؤں گی"-

"بات یہ ہے---- بھئی مجھے---- میرے سر میں درد ہے اس لئے آج تو نہیں ہاں کل پڑھا دوں گی" وہ نقل اتار کر بولا-

وہ بالکل جانے والا تھا۔

"اچھا بیٹھو" میں نے کہا اور وہ میرے سامنے پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"اور کتاب؟" میں نے پوچھا۔

"اور یہ آپ کے رشید چچا!" اس نے لفظ چچا کو بن کر بگاڑ کر بالکل بے تکے پن سے کہا۔ "ذرا موٹر تیز کرو بس گھگی بندھ جاتی ہے۔ ارے رے رے اتنی تیز کیوں ہانکتا ہے" بہادر نے مسخری صورت بنا کر رشید کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پڑھنا تو نکلو میرے کمرے سے چلو میں نہیں پڑھاتی"۔

"ایلوبو بگڑ گئیں۔ بزدل نہیں ہیں تمہارے رشید چچا" اس نے پھر لفظ چچا کو واضح طور پر کہا۔

میرا جی جل گیا۔ مگر کچھ کہتے بن نہ پڑا۔

"بہادر بھاگو یہاں سے میرا دماغ نہ چاٹو" میں نے عاجز آکر کہا۔

"آج وہ ----" اس نے پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ مگر پھر رک گیا۔

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں آپ کے تو سر میں درد ہے" وہ جانے کے لئے اٹھا۔

"تم رشید کے لئے کیا کہہ رہے تھے؟" میں نے اپنے شوق کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "ہاں اب ان کا" جو ذکر ہے تو جلدی جلدی پوچھ رہی ہیں نہیں بتاتے جایئے۔" وہ دروازے کی طرف چلا۔ پھر بولا۔ "آج جب وہ برآمدے میں کھڑے تھے تو میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ کیسے بے ہنگم لگ رہے تھے۔ بڈھے ہوگئے۔ مگر سنا ہے شادی کے بڑے شوقین ہیں"۔

میں کھسیانی ہوگئی۔ رشید چھ سال سے مجھ سے شادی کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ "میں نے سوچا" وہ دروازے کے پاس جاکر بولا "میں نے سوچا" بھئی کیسی بدقسمت وہ لڑکی ہوگی جو ---- جس سے ان کی شادی ہوگی۔

پیمانہ چھلک گیا۔ میں نے میز پر سے رو کر اٹھ کر حکم دیا۔ "نکلو بہادر میرے کمرے سے"

وہ چلا گیا- لیکن فوراً" پھر آکر کہا "اور ہاں وہ پھاٹک کے پاس کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں- انہوں نے مجھے آپ کو بلانے کے لئے بھیجا تھا- چلتی ہیں آپ یا جا کے کہہ دوں نہیں آتیں سر میں درد ہے- پھر وہ چلا-

کیا بتاؤں میرا کس قدر جی جلا- رشید نے مجھے بلانے کو بھیجا اور یہاں باتیں بنانے لگا-

"میں آرہی ہوں" میں نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا-

"میں تو کہے دیتا ہوں طبعیت ٹھیک نہیں بخار آرہا ہے" وہ مسکراتا ہوا تیزی سے چلا-

"نہیں" میں نے ڈانٹا اور جلدی سے مفلر لپیٹتی ہوئی اس کے پیچھے چلی-

"تیز آیئے- ورنہ پھر نہیں لے جائیں گے" اس نے میری جلدی دیکھ کر طعنہ دیا- رشید جلدی سے ٹوپی گھماتے آگے بڑھے-

لیجئے سرکار آگئیں" اس نے فتح مندانہ بلند آواز سے کہا- کہتی تھیں نہیں جاؤں گی-(سر میں درد ہے- میں نے کہا "چلئے بھئی سیر کو چلئے تو سب سب ٹھیک ہو جائے گا-" اس نے مکاری کا وار کر کے کہا-

رشید کا چہرہ چمک اٹھا اور وہ حسب عادت میری نبض ٹٹولنے لگا-

"اونہہ" میں نے جل کر کہا اور کار میں بیٹھ گئی- بہادر ڈرائیور کرنے لگا- اتنی تیزی سے موٹر اسٹارٹ کی معلوم ہوا بھونچال آگیا اور کھمبے سے موٹر ذرا ہی بچ کر نکلی-

"ارے!" رشید نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "ٹھیک سے نہیں ہانکتا"-

سامنے لگے ہوئے شیشے میں میں نے بہادر کی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کا مطالعہ کیا اور میں جل گئی- رشید سے کتنی مرتبہ کہا کہ "بھئی یہ "ہانکنا" کہاں کا لفظ ہے کوئی موٹر نہ ہوئی تانگہ یا چھکڑا ہو گئی جو ہانکی جائے- وہ فوراً" خوش مزاجی سے کہتے کہ "میرا مطلب چلانے سے ہے" مجھے ان کی بعض باتوں سے نفرت ہے-

باتوں میں خیال بھی نہ رہا اور بہادر نے موٹر کھڈوں اور نالیوں والی سڑک پر

ڈال دی۔ ایسے کہ بات کرنا دشوار ہوگیا۔ جوڑ جوڑ ہل گیا۔
"ابے ادھر کہاں لے آیا" رشید غرائے۔
"ارے تو آپ نے روکا بھی نہیں" اس نے الٹا الزام دیا خیر! آگے سیدھی سڑک ہے۔

موٹر پھر لڑھکنے لگی۔ چار میل گئے۔ مگر سیدھی سڑک کا خاک پتہ نہیں۔
رشید کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔ مجھے بھی صرف ہنسی آرہی تھی۔
"او۔ بھائی وہ تیری سیدھی سڑک کدھر ہے" رشید نے پوچھا۔
"ہوں---- بھول گیا۔ یہ سڑک تو اٹھارہ میل تک کھڑکھڑیا ہی چلی گئی ہے کیا موڑوں"

"اور نہیں تو کیا مار ڈالے گا" رشید بھنائے۔ "یار تم تو بس وہی ہولے کے جوڑ جوڑ ہلا ڈالا ہونہہ" رشید نے اپنا سر میرے سر سے ٹکرانے سے بچا کر کہا۔
سیر کیا خاک ہوتی۔ سارے راستے طوطوں کی طرح اڈے پر پنچے جمائے بیٹھے رہے۔ سر پھوٹ جانے کا الگ ڈر۔ گدیوں پر اچکتے اچکتے تھک گئے معلوم ہوا سیر نہیں بلکہ کشتی لڑ کر آرہے ہیں۔ بہادر نے فتح مندانہ مسکراہٹ سے مجھے دیکھا گویا کہتا ہے کہ "دیکھا کیسی سیر کرائی؟"
"شام کو کہاں چلئے گا۔ پانچ بجے موٹر نکال لوں"۔ اس نے تڑاق سے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔
"ابے ہٹ۔ ہم کیا مرنے کے لئے تیری موٹر میں جائیں گے" رشید نے ڈانٹا۔

رشید ہمیشہ بہادر سے بدتمیزی سے بولتے ہیں انہیں بڑی شکایت ہے کہ یہ نوکر ہو کر ذرا بھی مہذب نہیں۔ ابا نے سر چڑھا لیا ہے۔ بیہودہ ہے۔ کسی دن ٹھیک کردیا جائے گا۔ مگر بہادر خاک نہ سنتا بلکہ صرف شرارت سے مسکرا کر اور بھی

مذاق اڑانے پر تل جاتا۔

تم اتر کر باہر ہی بیٹھ گئے۔ رشید کو میرا اتنا خیال رہتا تھا کہ اگر ذرا سی چیز خریدتے تو سو مرتبہ میری رائے لیتے۔ ان کی کوٹھی اور فرنیچر میری خاص پسند کا تھا۔ موٹر ہم نے خود جا کر دہلی سے خریدی۔ جس پر خوبصورت حلقے میں مونو گرام بنوایا تھا۔ ہر چیز پر میرا مونو گرام تھا۔ سارے نوکر میری پسند سے رکھے جاتے اور نکالے جاتے تھے۔ رشید کے کپڑے اور مختلف چیزیں عموماً" میرے پسندیدہ رنگ کے ہوتے انہوں نے کبھی میری مخالفت نہ کی۔ جب میں چھوٹی سی تھی۔ جب ہی سے وہ مجھ سے ڈرتے تھے۔ مجھے چھیڑتے اور جب میں خفا ہو جاتی تو بے چین ہو جاتے انہیں اس میں ہی مزہ آتا تھا۔ مجھے اب تک ان سے روٹھ جانے کی عادت ہے ایک دفعہ انہوں نے مذاق ہی مذاق میں ذری چاندی کی چوڑی مچھلیوں والے حوض میں پھینک دی تو میں دس بارہ کی ڈھونگ وہی مچل گئی۔ بچارے فوراً" کوٹ اتار کر پانی میں اتر گئے مجھے اب تک یاد ہے وہ کتنے اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ سبز کائی ان کی ٹائی بالوں میں بے طرح الجھ گئی تھی اور سارے جسم پر سڑی گلی پتیاں چپکی ہوئی تھیں انہیں تکلیف پہنچا کر میرے دل میں گدگدی سی ہوتی تھی مجھے بڑا فخر تھا کہ ایسا بارعب اور طاقتور انسان میرے سامنے بھیگی بلی بن جاتا تھا۔ بھیا کا تو دم نکلتا تھا۔ مگر میں بہت دلیر تھی ذرا سی بات پر انہیں باتیں سنا کر رکھ دیتی وہ الٹے خوش ہوتے۔ مجھے ٹائیفائڈ ہوا تھا۔ رشید نے اپنے پیشے کی ساری ترکیبیں مجھے موٹا کرنے کیلئے صرف کردیں۔ اتنے ٹانک پلائے کہ میں پھول کر کپا ہوگئی اور بہادر اوبھیا مجھے چڑا چڑا کر کھاگئے۔ ڈاکٹر بھیا کو بہت چاہتے تھے۔ مگر بھیا بے وقوف ان سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ رشید اور رشید کی ساری چیزیں میرے آنے کی منتظر تھیں کتنے ہی نئے سیٹ خریدے کتنے ہی موٹر میرے مونوگرام سے سجائے گئے۔ مگر وہ مجھے کبھی وہاں پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ ابا سے جب رشتے تقاضا کرتے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کردیتے۔ رشید مجھے ایک نئے آتش دان کا نقشہ زمین پر کھینچ کر بتاتے کہ سامنے سے ایک مرکھنی سی گائے دم اٹھائے دوڑتی ہوئی سیدھی ہماری طرف لپکی۔ بندو پیچھے ڈنڈا لے کر

دوڑا غل سن کر بہادر بھی اپنی کوٹھڑی میں سے جھانکا نہ جانے کیا سوچ کر ایک چھوٹی سی لکڑی لے کر ایسے گائے کو ہماری طرف ہنکا کر لایا کہ وہ پھاٹک چھوڑنے کے ہماری طرف آئی۔

گائے بیل اور بچھو تین چیزوں سے میرا دم نکلتا ہے۔

"ارے ادھر مت ہانک بہادر" رشید ڈر کر ڈانٹنے لگے۔

لفظ "ہانک" پر بہادر ہنسی سے لوٹ گیا۔ اگر ہم منڈیروں پر نہ چڑھ جاتے تو یقیناً" گائے ہمارا آٹا کر دیتی۔ بہادر مجھے غلط انداز سے چھیڑتا ہوا گائے کے پیچھے بھاگا چلا گیا۔ اگر رشید کو بہادر کی مکاریوں کا ذرا بھی پتہ چل جاتا تو وہ عذر مچا دیتے وہ اسے صرف ایک بے وقوف گدھا سمجھتے تھے۔

اس دفعہ رشید کچھ پڑیسے پیچھے پڑے کے ابا شادی پر راضی ہوگئے ہیں اور رشید دن بھر سامان خریدتے پھرتے۔ خالہ جان بھی انتظام میں مدد دیتے آگئیں۔ اماں کے بعد وہی تھیں جو ہماری قریبی رشتہ دار تھیں۔

بہادر خاموش، ہمیں دن بھر موٹر میں لادے پھرتا تھا۔ رشید چھٹی لے کر آ گئے تھے۔ اور مجھے ہفتوں بہادر سے بات کرنے کا بھی وقت نہ ملتا تھا۔ بہادر کی بدمزاجی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ مجھ سے بالکل بات نہ کرتا اور اگر کرتا تو ترشی سے۔ بات بات پر ہر ایک سے الجھ پڑتا۔ یہاں تک کہ ابا نے جو کچھ کہا تو غرا کر انہیں گھورنے لگا۔ ابا میں غضب کا تحمل ہے دوسرے وہ اسے چاہتے بھی بہت ہیں۔ بالکل چپ رہ گئے مجھے بہادر کو دیکھ کر بڑا رنج ہوتا بھیا کے چلے جانے کے بعد سہیلی کہو، بھائی کہو، یا نوکر سب کچھ یہ بہادر ہی تھا۔ رشید بے شک میرا لاڈ کرتے تھے۔ بہادر اور ہی تھا میرا بچپن کا ساتھی اور اب وہ مجھ سے بات تک کرنا پسند نہ کرتا تھا وہ پہلے سے زیادہ زرد اور دبلا ہوگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بہادر مجھ سے خفا ہے۔ یہ رشید تو نہ تھے کہ اگر کبھی خفا ہو بھی جائیں تو ان کا بہتری علاج یہ ہے کہ خود خفا ہو جاؤں بس وہ فوراً" الٹی خوشامد شروع کر دیتے تھے یہاں بہادر کا سوال تھا جو صرف

خوشامد کرانے کا عادی تھا۔

رشید ایک دکان پر سوٹ کا آرڈر دینے اترے۔ میں نے بہادر سے پوچھا "یہ تمہاری تھوتنی کیوں سوجی ہوئی ہے"۔

کوئی اور وقت ہوتا تو بہادر ایسا منہ توڑ جواب دیتا کہ میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔ لیکن وہ صرف کھسیانی ہنسی زبردستی ہنسنے لگا۔

"کبھی دماغ درست ہی نہیں ہوتا جب دیکھو جب منہ ڈبل روٹی ہو رہا ہے آخر کوئی وجہ بھی ہو" میں نے نرمی سے ملامت کی۔

"میں کس پر غصہ کروں گا بھلا۔ میں ایک پھٹا ہوا نوکر اور کسی سے غصہ ہو جاؤں تو پھر روٹی کہاں ملے گی" وہ افسردہ ہو کر مجھ سے دور دیکھنے لگا۔

"نہیں تم کچھ بدل ہی گئے ہو"۔ رشید آگئے اور ہم واپس چلے آئے۔

میرا دل بہادر سے کھل کر باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے بلایا۔

"بہادر ذرا میری ساڑھی پر استری کردو"۔

لیجئے! یہ کوئی میرا کام ہے۔ ننھا کو بھیجے دیتا ہوں" وہ مڑا۔

"نہیں وہ ٹھیک نہیں کرتا۔ دوسرے وہ میری استری توڑ دے گا"۔

"اچھا لائیے مجھے ساڑھیاں اور استری دے دیجئے میں کرلاؤں گا"

"میرے کمرے ہی میں بڑی میز پر کرلو۔ میں تمہیں اپنی بجلی کی استری توڑنے کے لئے نہ دوں گی"

"تو پھر کروا لیجئے کسی اور سے" اس نے سوکھا منہ بنا کر کہا۔

ادھر آؤ" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

وہ قریب آیا۔

"چلو"۔ میں نے اس کا کان پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف لے جا کر کہا۔ "ساڑھیاں نکالو اور سیدھی طرح استری کرو"

وہ مسکرانے لگا۔ اس کا پتلا سا زرد چہرہ خون کی گرمی سے بادامی ہوگیا اور آنکھیں بھیگ گئیں وہ خوش تھا۔ صندوق میں سے ساڑھیاں نکال کر وہ استری

کرنے لگا۔ میں کھڑکی کے قریب اسٹول پر بیٹھ گئی۔

اس کے کھردرے بڑے بڑے بالوں دار ہاتھ چمکتی ہوئی استری اور رنگ برنگی ساڑھیاں میرے لئے ایک کھیل بن گئیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک نئی جان پیدا ہوگئی تھی۔ استری کے ساتھ ساتھ اس کی چمکیلی آنکھیں آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں اس نے اپنے گداز زیریں لب کو دانتوں سے دبائے رکھا تھا۔ جیسے کہ سخت مصروفیت اور کام کے وقت دبا لیتے ہیں۔ کف بے تکے پن سے اس کی آستینوں میں جھول رہے تھے۔ ابا کے چوڑے چکلے دامن کی قمیض اور بھیا کے ڈھیلے ڈھالے پتلون میں وہ ایک تنکا معلوم ہو رہا تھا۔

گریبان کے تمام بٹن ٹوٹ گئے تھے اور اس کا سینہ بہت سا کھلا ہوا تھا۔ جس پر پسلیوں کا جال بخوبی نظر آتا تھا۔ اس کے بے رونق کنگھی بال بے ترتیب گچھوں کی صورت میں اس کی پژمردہ مگر بلند اور ذہین پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں اسے متواتر غور سے دیکھ رہی تھی میرا دل دکھ گیا۔ آہ بے رحم زمانہ نے اسے ایک ذلیل و خوار خدمت گار بنا دیا تھا۔ ورنہ وہ ذہانت اور عقلمندی کا مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔ نہ جانے کتنے بلند دماغ صرف غربت کے ہاتھوں کچل کر خاک راہ سے بدترین جاتے ہیں۔ اگر اسے اعلیٰ تعلیم دی جاتی اور اس کے پاس روپیہ ہوتا تو وہ کتنی شان دار ہستی بن جاتا۔ وہ ایک ذلیل نوکر تھا جس نے بچپنے سے اپنی ہی جنس کی دل و جان سے خدمت کی تھی۔ لیکن پھر بھی کوئی بات تھی کہ وہ نمایاں ہستی معلوم ہوتی تھی۔ زندگی کے ہر معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑے کام میں وہ ایک قابل تعریف عقلمندی کا ثبوت دیتا تھا۔ میں اسے محویت کے عالم میں تک رہی تھی اس نے کئی دفعہ اچٹتی ہوئی نظر میری طرف ڈالی اور مجھے اپنے طرف گھورتے دیکھ کر وہ بے اختیار ایک مظلوم مسکراہٹ میں ڈوب گیا۔

اس نے سیاہ باریک ساڑھی کی چار تہیں کر کے میز پر پھسلا دیا اور استری سیاہ بادلوں میں بجلی کی طرح تیزی سے کوندنے لگی۔

ایک سحر تھا کہ جس نے مجھے بے خود کر دیا۔ کوئی سخت سی چیز میرے گلے میں بار بار اٹکتی ہوئی اور آنکھیں دھندلی سی ہو گئیں۔ میں کھڑی ہو گئی۔ بہادر کا ہاتھ رک گیا اور اس نے مجھے ایک لمحہ تک بے معنی نظروں سے دیکھا لیکن یکایک جذبات کے ہجوم اور خیالات کی خاموش گھٹائیں اس کی آنکھوں میں چھا گئیں۔ میں آہستہ سے اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ چہرہ کسی ناقابل بیان تکلیف سے تمتما اٹھا۔ اس کے ہونٹ خون کی زیادتی کی وجہ سے انگارہ ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا پھٹ جائیں گے اس کے ہاتھوں میں ایک لرزش تھی جسے وہ جھنجلا جھنجلا کر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم نہ بتاؤ گے؟" میں نے اس کے اس کے استری والے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ وہ مضبوطی سے استری کو پکڑے رہا اور میرا ہاتھ اس کے ہاتھ کو جو کانپ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے میری طرف دیکھا اور اس مرتبہ ایسے کہ دوبارہ کسی سوال کی ضرورت نہ رہی۔ میں نے استری لے کر اس کے ہاتھ سے رکھ دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گریبان بند کرنے لگا۔ پریشانی کے علاوہ اور کچھ بھی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اس کی پلکیں بوجھل ہو کر لرز رہی تھیں اور اس کے ہونٹ ایک سسکی میں مچل جانے کو تیار تھے۔

"بولتے کیوں نہیں؟" میں نے نرمی سے قریب ہو کر کہا۔

"میں ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔ کیا بولوں!" وہ لفظ چبانے لگا۔

"تم رنجیدہ نہیں رہتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

وہ چپ رہا۔

"کیوں رنجیدہ رہتے ہو؟" میں نے پھر کہا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" اس نے پریشانی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم! جھوٹے ۔۔۔!" میں نے لفظ جما کر کہا۔

"اچھ" اس نے سر ہلا کر اپنے جھوٹ کا اور بھی پختہ ثبوت دیا۔

"میں دھوکے میں تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو" میں

نے سب کچھ سمجھ کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ "بنو مت۔ تم خوب سمجھتی ہو۔" مگر وہ چپ تھا۔

وہ تھوڑی دیر کھڑا غیر مطمئن نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ اس نے چاہا کے باہر چلا جائے۔ لیکن پھر ایک دم اس کا وہی غصہ اور جنون عود کر آیا۔ وہ تیزی سے میری طرف جھپٹا۔ اور میرے اتنے قریب آکر رکا کہ میں سمجھی وہ ضرور میرے اوپر گر پڑے گا۔

آپ سمجھتی ہیں--- آپ کھیل رہی ہیں، مجھ غریب سے-- آپ کھیل رہی ہیں--- آپ جانتی ہیں۔" اور وہ جھنجھلا کر اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ آنسو بے اختیار بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔

میں نے اس کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ وہ خاموش میری طرف تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ خاموش افسانوں کی ضخیم جلدیں میرے سامنے کھل گئیں۔

"بہادر!" میں نے کہا۔

اور وہ میرے قریب گر پڑا۔ اور اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔ بڑی دیر تک وہ گہری سسکیاں لیتا رہا۔

"تمہیں رنجیدہ دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے بہادر" میں نے اس کے سر کو سہارا دے کر کہا۔

"تو نہ دیکھا کیجئے میری طرف" اس نے غرور سے کہا۔

"نہ دیکھا کروں تمہاری طرف" میں نے گویا خود سے کہا۔

"ہاں، کیا فائدہ؟"

"کیا ہر کام انسان فائدے کے خیال ہی سے کرتا ہے؟"

"ہاں اور جو نہیں کرتا وہ دکھ اٹھاتا ہے"

"کیا دکھ بڑے کٹھن ہوتے ہیں؟"

"ہاں ایک بھوکے ننگے خدمت گار کے لئے"۔ اس نے انگلیاں چٹخا کر کہا۔

"اور جو بھوکے ننگے خدمت گار نہیں ہوتے انہیں کیا دکھ نہیں ہوتا؟"
"کیا ان کو بھی دکھ ہوتا ہے" وہ امید بھری آواز میں بولا اور سیدھا ہو بیٹھا۔
"ہاں"۔
"کیا وہ بھی اپنی ٹوٹی ہوئی کوٹھڑی ---- نہیں ---- میرا مطلب ہے صاف ستھرے کمرے میں چھپ کر رویا کرتے ہیں" اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔
"ہاں"۔
"اور کیا وہ بھی ان ---- وہ بھی ایک امیر اور طاقتور انسان کو دیکھ کر وہ ---- کہ جب وہ ---- اس کو دیکھتے ہیں تو گھنٹوں جلا کرتے ہیں"۔ اس نے چبا چبا کر بے ترتیبی سے کہا۔
"کون سے طاقتور امیر انسان کو؟ رشید کو!" میں شرارت سے کہا۔
"ہاں" اور وہ شرمندہ ہو کر زور سے ہنسا۔
"تم ---- طاقتور انسان کی یہی تو پہچان نہیں کہ وہ موٹا اور بہت سا روپیہ رکھتا ہو۔ بلکہ ---- بعض --- بلکہ ---" میں الفاظ ڈھونڈنے لگی۔
"بلکہ؟" اس نے شوق سے پوچھا۔
"تم بے وقوف ہو" میں نے اسے دور دھکیل کر کہا۔
آقا اور خادم کا رشتہ کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔

اس کے چند دن کیسے گزرے۔ شاید ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں بس اتنا کہنا کافی ہے کہ مسلسل خفگیاں اور خودکشی کی دھمکیاں چلیں۔ اور آنسوؤں کی نہریں بہہ گئیں۔
ابا اتنے ہی سنجیدہ اور خاموش رہے۔
رشید کی نئی کار پر میرے مونوگرام کی جگہ ایک سیاہ مپٹہ نظر آنے لگا ہے انہیں اب چھٹی بالکل نہیں ملتی۔

میں کالج برابر جاتی ہوں۔
بہادر وقت پر موٹر اب بھی نہیں لاتا۔ ہمیشہ جلدی لاتا ہے۔
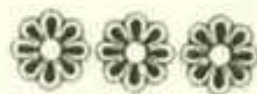
بھابی

بھابی بیاہ کر آئی تھی تو مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ بڑھوار بھی تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ بھیا کی صورت سے ایسی لرزتی تھی جیسے قصائی سے گائے مگر سال بھر کے اندر ہی وہ تو جیسے منہ بند کلی سے کھل کر پھول بن گئی جسم بھر گیا۔ بال گھمیرے ہوگئے۔ آنکھوں میں ہرنوں جیسی وحشت دور ہوکر غرور اور شرارت بھر گئی۔

بھابی ذرا آزاد قسم کے خاندان سے تھی، کانونیٹ میں تعلیم پائی تھی۔ پچھلے سال اس کی بڑی بہن ایک عیسائی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس لئے اس کے ماں باپ نے ڈر کے مارے جلدی سے اسے کانونیٹ سے اٹھایا اور چٹ پٹ شادی کردی۔

بھابی آزاد فضا میں پلی تھی۔ ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے کی عادی تھی مگر سسرال اور میکہ دونوں طرف سے اس پر کڑی نگرانی تھی اور بھیا کی بھی یہی کوشش تھی کہ اگر جلدی سے اسے پکی گھر ہستن نہ بنادیا گیا تو وہ بھی اپنی بڑی بہن کی طرح کوئی گل کھلائے گی۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھی۔ لہٰذا اسے گھر ہستن بنانے پر جٹ گئے۔

چار پانچ سال کے اندر بھابی کو گھس گھسا کر واقعی سب نے گھر ہستن بنادیا۔ وہ تین بچوں کی ماں بن کر بھدی اور بھُس ہوگئی۔ اماں اسے خوب مرغی کا شوربا، گوند سنورے کھلاتیں۔ بھیا ٹانک پلاتے اور ہر بچے کے بعد وہ دس پندرہ پونڈ بڑھ جاتی۔

آہستہ آہستہ اس نے بننا سنورنا چھوڑ ہی دیا تھا۔ بھیا کو لپ اسٹک سے نفرت تھی۔ آنکھوں میں منوں کاجل اور مسکارا دیکھ کر وہ چڑ جاتے۔ بھیا کو بس

گلابی رنگ پسند تھا یا پھر سرخ---- بھابی زیادہ تر گلابی یا سرخ ہی کپڑے پہنا کرتی تھی- گلابی ساڑھی پر سرخ بلاؤز یا کبھی گلابی کے ساتھ ہلکا گہرا گلابی-

شادی کے وقت اس کے بال کٹے ہوئے تھے- مگر دولہن بناتے وقت ایسے تیل چپڑ کر باندھے گئے تھے، لیکن پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ پر کٹی میم ہے اب اس کے بال تو بڑھ گئے تھے، لیکن پے در پے بچے ہونے کی وجہ سے وہ ذرا گنجی سی ہو گئی تھی- ویسے بھی وہ بال کس کر میلی دھجی ہی باندھ لیا کرتی تھی- اس کے میاں کو وہ میلی کچیلی ایسی ہی بڑی پیاری لگتی تھی اور میکے سسرال والے بھی اس کی سادگی کو دیکھ کر اس کی تعریفوں کے گن گاتے تھے- بھابی تھی بڑی پیاری سی، بجیل نقشہ مکھن جیسی رنگت، سڈول ہاتھ، پاؤں- مگر اس نے اس بری طرح اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا کہ خمیرے آٹے کی طرح بہہ گئی تھی-

بھیا اس سے نو برس بڑے تھے مگر اس کے سامنے لونڈے سے لگتے تھے- ویسے ہی سڈول کسرتی بدن والے، روز ورزش کرتے، بڑی احتیاط سے کھانا کھاتے بڑے حساب سے سگریٹ پیتے- یونہی کبھی وہسکی بیئر چکھ لیتے- ان کے چہرے پر اب لڑکپن تھا- تھے بھی تیس اکتیس برس کے- مگر چوبیس پچیس برس کے ہی لگتے تھے-

اف بھیا کو جین اور اسکرٹ سے کیسی نفرت تھی- انہیں یہ نئے فیشن کی بے استنبول کی بدن پر چپکی ہوئی قمیض سے بھی بڑی گھن آتی تھی- تنگ موری کی شلواروں سے تو وہ ایسے جلتے تھے کہ توبہ خیر، بھابی بے چاری تو شلوار قمیض کے قابل رہ ہی نہیں گئی تھی- وہ تو بس زیادہ تر بلاؤز اور پیٹی کوٹ پر ڈریسنگ گاؤن چڑھائے گھوما کرتی- کوئی جان پہچان والا آجاتا تو بھی بے تکلفی سے وہی اپنا نیشنل ڈریس پہنے رہتی- کوئی پر تکلف مہمان آتا تو عموماً" وہ اندر ہی بچوں سے سر مارا کرتی جو کبھی باہر آنا پڑتا تو ملگجی سی ساڑھی لپیٹ لیتی- وہ گھر ہستن تھی، بہو تھی اور چہیتی تھی، اسے رنڈیوں کی طرح بن سنور کر کسی کو لبھانے کی کیا ضرورت تھی-

اور بھابی شاید یونہی گودڑ بنی ادھیڑ اور پھر بوڑھی ہو جاتی- بہوئیں بیاہ کر لاتی

جو صبح اٹھ کر اسے جھک کر سلام کرتیں گود میں پوتا کھلانے کو دیتیں۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شام کا وقت تھا ہم سب لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بھابی پاپڑ تلنے باورچی خانہ میں گئی تھی۔ باورچی نے پاپڑ لال کردیئے بھیا کو بادامی پاپڑ بھاتے ہیں۔

انہوں نے پیار سے بھابی کی طرف دیکھا اور وہ جھٹ اٹھ کر پاپڑ تلنے چلی گئی ہم لوگ مزے سے چائے پیتے رہے۔ ہائے بھابی تھی کہ فرشتہ میں تو کالج سے آکر باورچی خانہ میں جانے پر کسی طرح مجبور ہی نہیں کی جاسکتی تھی اور نہ ہی میرا شام کو پر تکلف لباس باورچی خانہ کے لئے موزوں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے پاپڑ تلنے ہی کب آتے تھے۔ دوسری بہنیں بھی میری قطار میں کھڑی تھیں۔ فریدہ کا منگیتر آیا تھا۔ وہ اس کی طرف جٹی ہوئی تھی' رضیہ اور شمیم اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں لڑانے میں مصروف تھیں۔ وہ کیا پاپڑ تلتیں۔ اور ہم سب تو بابل کے آنگن کی چڑیاں تھیں اور اڑنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔

دھائیں سے فٹ بال آکر عین بھیا کی پیالی میں پڑی۔ ہم سب اچھل پڑے۔ بھیا مارے غصہ کے بھنا اٹھے۔

"کون پاجی ہے؟" انہوں نے جدھر سے گیند آئی تھی ادھر منہ کر کے ڈانٹا۔

بکھرے ہوئے بالوں کا گول مول سر اور بڑی بڑی آنکھیں اوپر سے جھانکیں۔ ایک زقند میں بھیا منڈیر پر تھے اور مجرم کے بال ان کی گرفت میں۔

"اوہ!" ایک چیخ گونجی اور دوسرے لمحے بھیا ایسے اچھل کر الگ ہوگئے جیسے انہوں نے بچھو کے ڈنگ پر ہاتھ ڈال دیا ہو یا انگارہ پکڑ لیا ہو۔

"سوری---- آئی ایم ویری سوری----" وہ ہکلا رہے تھے۔ ہم سب دوڑ کر گئے۔ دیکھا تو منڈیر کے اس طرف ایک دبلی پتلی ناگن سی لڑکی سفید ڈرین پائپ اور نیبو کے رنگ کا سلیولیس بلاؤز پہنے اپنے میرلین منرو کی طرح کٹے ہوئے بالوں میں پتلی پتلی انگلیاں پھیر کر کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔

بھابی پاپڑوں کی پلیٹ لئے اندر سے نکلی اور بغیر پوچھے گچھے یہ سمجھ کر ہنسنے لگی کہ ضرور کوئی ہنسنے کی بات ہوئی ہوگی۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا پیٹ ہنسنے میں پھدکنے لگا اور جب اسے معلوم ہوا کہ بھیا نے شبنم کو لونڈا سمجھ کر اس کے بال پکڑ لیے تو وہ اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگی کہ کئی پاپڑ کے ٹکڑے گھاس پر بکھر گئے۔ شبنم نے بتایا کہ وہ اسی دن اپنے چچا خالد جمیل کے ہاں آئی ہے۔ اکیلے جی گھبرایا تو فٹ بال ہی لڑھکانے لگی جو قسمت سے بھیا جی کی پیالی پر آن کودی۔

شبنم بھیا کو اپنی تیکھی مسکارہ لگی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ بھیا مسحور سناٹے میں اسے تک رہے تھے۔ ایک کرنٹ ان دونوں کے درمیان دوڑ رہا تھا بھابھی اس کرنٹ سے کٹی ہوئی جیسے کوسوں دور کھڑی تھی۔ اس کا پھدکتا ہوا پیٹ سہم کر رک گیا۔ ہنسی نے اس کے ہونٹوں پر لڑکھڑا کر دم توڑ دیا۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے ہوگئے۔ پلیٹ ٹیڑھی ہو کر پاپڑ گھاس پر گرنے لگے۔ پھر ایک دم وہ دونوں جاگ پڑے اور خوابوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔

شبنم پھدک کر منڈیر پر چڑھ گئی۔

"آیئے چائے پی لیجئے"۔ میں نے ٹھہری ہوئی فضا کو دھکا دے کر آگے کھسکایا۔

ایک لچک کے ساتھ شبنم نے اپنے پیر منڈیر کے اس پار سے اس پار جھلائے۔ سفید چھوٹے چھوٹے مکاسن ہری گھاس پر فاختہ کے جوڑے کی طرح تھمکنے لگے۔ شبنم کا رنگ پگھلے ہوئے سونے کی طرح لو دے رہا تھا۔ اس کے بال سیاہ بھونرا تھے۔ مگر آنکھیں جیسے سیاہ کٹوریوں میں کسی نے شہد بھر دیا ہو۔ نیبو کے رنگ کے بلاؤز کا گلا بہت گہرا تھا۔ ہونٹ تربوزی رنگ کے اور اسی رنگ کی نیل پالش لگائے وہ بالکل کسی امریکی اشتہار کا ماڈل معلوم ہو رہی تھی۔ بھابی سے کوئی فٹ بھر لانبی لگ رہی تھی حالانکہ مشکل سے دو انچ اونچی ہوگی۔ اس کی ہڈی بڑی نازک تھی۔ اس لیے کمر تو ایسی کہ چھلے میں پرولو۔

بھیا کچھ گم سم سے بیٹھے تھے۔ بھابی انہیں ایسے تاک رہی تھی۔ جیسے بلی پر

تولتے ہوئے پرندے کو گھورتی ہے کہ جیسے ہی پر پھڑپھڑائے بڑھ کر دبوچ لے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اتنے میں منا آکر اس کی پیٹھ پر دھم سے کودا۔ وہ ہمیشہ اس کی پیٹھ پر ایسے کودا کرتا تھا جیسے وہ گدگدا سا تکیہ ہو۔ بھابی ہمیشہ ہی ہنس دیا کرتی تھی۔ مگر آج اس نے چٹاخ پٹاخ دو چار چانٹے جڑ دیئے۔

شبنم پریشان ہوگئی۔

"ارے ارے۔۔۔۔ روکئے نا۔۔۔۔" اس نے بھیا کا ہاتھ چھو کر کہا:

"بڑی غصہ ور ہیں آپ کی ممی"۔ اس نے میری طرف منہ پھیر کر کہا۔

انٹروڈکشن ہماری سوسائٹی میں بہت کم ہوا کرتا ہے اور پھر بھابی کا کسی سے انٹروڈکشن کرانا عجیب سا لگتا تھا۔ وہ تو صورت سے ہی گھر کی بہو لگتی تھی۔ شبنم کی بات پر ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ بھابی منے کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر چل دی۔

"ارے یہ تو ہماری بھابی ہے"۔ میں نے بھابی کو دھم دھم جاتے ہوئے دیکھ کر کہا:

"بھابی؟" شبنم حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"ان کی بھیا کی بیوی"۔

"اوہ۔۔۔۔" اس نے سنجیدگی سے اپنی نظریں جھکالیں"۔ میں میں سمجھی!" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بھابی کی عمر تیئس سال ہے"۔ میں نے وضاحت کی۔

"مگر ڈونٹ بی سلی۔۔۔۔" شبنم ہنسی۔۔۔۔ بھیا بھی اٹھ کر چل دیئے۔

"خدا کی قسم"۔

"اوہ۔۔۔۔ جہالت۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔۔ بھابی نے مارٹیز سے پندرہ سال کی عمر میں سینئر کیمرج کیا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ یہ مجھ سے تین سال چھوٹی ہیں۔ میں چھبیس سال کی

ہوں۔"

"تب تو قطعی چھوٹی ہیں"۔

اف اور میں سمجھی وہ تمہاری ممی ہیں۔ دراصل میری آنکھیں کمزور ہیں۔ مگر مجھے عینک سے نفرت ہے۔ برا لگا ہو گا انہیں"۔

"نہیں بھابی کو کچھ برا نہیں لگتا"۔

"چہ۔۔۔۔ بیچاری"۔۔۔۔

کون "کون۔۔۔۔ بھابی"۔ ناجانے میں نے کیوں کہا۔

"بھیا اپنی بیوی پر جان دیتے ہیں"۔ صفیہ نے بطور وکیل کہا۔

"بیچارے کی بہت بچپن میں شادی کر دی گئی ہو گی"۔

"پچیس چھبیس سال کے تھے"۔

"مگر مجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ بیسویں صدی میں بغیر دیکھے شادیاں ہوتی ہیں"۔ شبنم نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔

"تمہارا ہر اندازا غلط نکل رہا ہے۔۔۔۔ بھیا نے بھابی کو دیکھ کر بیحد پسند کر لیا تھا۔ تب شادی ہوئی تھی۔ مگر جب وہ کنول کے پھول جیسی نازک اور حسین تھیں"۔

"پھر یہ کیا ہو گیا شادی کے بعد؟"

"ہوتا کیا۔۔۔۔ بھابی اپنے گھر کی ملکہ ہیں بچوں کی ملکہ ہیں۔ کوئی فلم ایکٹریس تو ہیں نہیں۔ دوسرے بھیا کو سوکھی ماری لڑکیوں سے گھن آتی ہے"۔ میں نے جان کر شبنم پر چوٹ کی۔ وہ بے وقوف نہ تھی۔

بھئی چاہے مجھ سے کوئی پیار کرے یا نہ کرے۔ میں تو کسی کو خوش کرنے کے لئے ہاتھی کا بچہ کبھی نہ بنوں۔۔۔۔ اوہ معاف کرنا تمہاری بھابی کبھی بہت خوبصورت ہوں گی مگر اب تو۔۔۔۔"

"اُنھ' آپ کا نکتہ نظر بھیا سے مختلف ہے۔ میں نے بات ٹال دی اور جب وہ بل کھاتی سیدھی سڈول ٹانگوں کو آگے پیچھے جھلاتی ننھے ننھے قدم رکھتی منڈیر کی

طرف جا رہی تھی۔ بھیا برآمدے میں کھڑے تھے۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اور بار بار اپنی گدی سہلا رہے تھے۔ جیسے کسی نے وہاں جلتی ہوئی آگ رکھ دی ہو۔ چڑیا کی طرح پھدک کر وہ منڈیر پھلانگ گئی۔ پل بھر کو پلٹ کر اس نے اپنی شربتی آنکھوں سے بھیا کو تولا اور چھلاوہ کی طرح کوٹھی میں غائب ہو گئی۔

بھابی لان پر جھکی ہوئی بالیں سمیٹ رہی تھی۔ مگر اس نے ایک نظر نہ آنے والا تار دیکھ لیا۔ جو بھیا جی اور شبنم کی نگاہوں کے درمیان دوڑ رہا تھا۔

ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ شبنم پھولا ہوا اسکرٹ اور سفید کھلے گلے کا بلاؤز پہنے پپو کے ساتھ سمبا ناچ رہی تھی اس کا ننھا سا پکینیز کتا ٹانگوں میں الجھ رہا تھا۔ وہ اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کی سڈول سانولی ٹانگیں ہری ہری گھاس پر تھرک رہی تھیں۔ سیاہ ریشمی بال ہوا میں چھلک رہے تھے۔ پانچ سال کا پپو بندر کی طرح پھدک رہا تھا۔ مگر وہ نشیلی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ اس نے ناچتے ناچتے ناک پر انگوٹھا رکھ کر مجھے چڑایا۔ میں نے جواب میں گھونسا دکھا دیا۔ مگر فوراً ہی مجھے اس کی نگاہوں کا پیچھا کر کے معلوم ہوا یہ اشارہ وہ میری طرف نہیں کر رہی تھی۔ بھیا برآمدے میں احمقوں کی طرح کھڑے گدی سہلا رہے تھے۔ اور وہ انہیں منہ چڑا کر جلا رہی تھی۔ اس کی کمر میں بل پڑ رہے تھے۔ کولہے مٹک رہے تھے۔ بانہیں تھرتھرا رہی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے جدا لرز رہے تھے۔ اس نے سانپ کی طرح لپ سے زبان نکال کر اپنے ہونٹ کو چاٹا۔ بھیا کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔۔۔۔ بھابی گودام میں اناج تلوا کر باورچی کو دے رہی تھی۔

"شبنم کی بچی۔۔۔" میں نے دل میں سوچا۔۔۔۔ مگر غصہ مجھے بھیا پر بھی آیا۔ انہیں دانت نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں تو شبنم جیسی کرنٹیوں سے نفرت تھی۔ انہیں تو انگریزی ناچوں سے گھن آتی تھی۔ پھر وہ کیوں کھڑے اسے تک رہے ہیں اور ایسی بھی کیا بے سدھی کہ ان کا جسم سنبا کی تال پر لرز رہا تھا اور انہیں خبر نہ تھی۔

اتنے میں بوائے چائے کی ٹرے لے کر لان پر آگیا---- بھیا نے ہم سب کو آواز دی اور بوائے سے کہا بھابی کو بھیج دے۔

رسماً" شبنم کو بلاوا دینا پڑا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا قطعی اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاؤں مگر جب وہ منے کو بڈھی پر چڑھائے منڈیر پھلانگ کر آئی تو نہ جانے کیوں مجھے وہ قطعی معصوم لگی' منا سکارف لگاموں کی تھامے ہوئے تھا اور وہ گھوڑے کی چال اچھلتی ہوئی لان پر دوڑ رہی تھی۔ بھیا نے منے کو اس کی پیٹھ سے اتارنا چاہا۔ مگر وہ اور چمٹ گیا۔

"ابھی اور گھوڑا چلے آنٹی۔"

"نہیں بابا---- آنٹی میں دم نہیں----" شبنم چلائی۔ بڑی مشکل سے منے کو بھیا نے اتارا۔ منہ پر ایک چانٹا لگایا ایک دم تڑپ کر شبنم نے اسے گود میں اٹھا لیا اور بھیا کے ہاتھ پر زور کا تھپڑ لگایا۔

"شرم نہیں آتی---- اتنے بڑے اونٹ کے اونٹ ذرا سے بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہیں"۔ بھابی کو آتا دیکھ کر اس نے منے کو ان کی گود میں دے دیا۔ اس کا چانٹا کھا کر بھیا مسکرا رہے تھے۔

"دیکھئے تو کتنی زور سے تھپڑ مارا ہے۔ میرے بچے کو کوئی مارتا تو ہاتھ توڑ کر رکھ دیتی"۔ اس نے شربت کی کٹوریوں میں زہر گھول کر بھیا کو دیکھا۔ "اور پھر ہنس رہے ہیں بے حیا"۔

"ہوں۔ دم بھی ہے---- جو ہاتھ توڑو گی----" بھیا نے اس کی کلائی مروڑی۔ وہ بل کھا کر اتنی زور سے چیخی کے بھیا نے لرز کر اسے چھوڑ دیا اور وہ ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ گئی۔ چائے کے درمیان بھی شبنم کی شرارتیں چلتی رہیں وہ بالکل کم سن چوکھریوں کی طرح چہلیں کر رہی تھی۔ بھابی گم سم بیٹھی تھیں۔ آپ سمجھے ہوں گے۔ شبنم کے وجود سے ڈر کر انہوں نے کچھ اپنی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہوگی۔ جی قطعی نہیں۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ میلی رہنے لگیں۔ پہلے سے بھی زیادہ کھاتیں۔ ہم سب تو ہنس زیادہ رہے تھے۔ مگر وہ سر جھکائے نہایت انہماک

سے کیک اڑانے میں مصروف تھیں۔ چٹنی لگا لگا کر بھجئے نگل رہی تھیں۔ سکے ہوئے توسوں پر ڈھیر سا مکھن اور جیل تھوپ گردے کھائے جا رہی تھیں' بھیا اور شبنم کو دیکھ دیکھ کر ہم سب ہی پریشان تھے اور شاید بھابی فکر مند ہو گی وہ اپنی پریشانی کو مرغن کھانوں میں دفن کر رہی تھیں۔ انہیں ہر وقت کھٹی ڈکاریں آیا کرتیں مگر وہ چورن کھا کھا کر پلاؤ قورمہ ہضم کرتیں۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے بھیا جی اور شبنم کو ہنستا بولتا دیکھتیں۔ بھیا تو کچھ اور بھی لونڈے لگنے لگے تھے۔ شبنم کے ساتھ وہ صبح و شام سمندر میں تیرتے۔ بھابی اچھا بھلا تیرنا جانتی۔ مگر بھیا کو سوئمنگ سوٹ پہنی عورتوں سے بہت نفرت تھی۔ ایک دن ہم سب سمندر میں نہا رہے تھے۔ شبنم دو دھجیاں پہنے ناگن کی طرح پانی میں بل کھا رہی تھی۔ اتنے میں بھابی جو دیر سے منے کو پکار رہی تھیں۔ آگئیں۔ بھیا شرارت کے موڈ میں تو تھے ہی' دوڑ کر انہیں پکڑ لیا اور ہم سب نے مل کر انہیں پانی میں گھسیٹ لیا جب سے شبنم آئی تھی۔ بھیا بہت شریر ہو گئے تھے۔ ایک دم سے وہ دانت کچکچا کر بھابی کو ہم سب کے سامنے بھینچ لیتے۔ انہیں گود میں اٹھانے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ ان کے ہاتھوں میں سے یو نبل مچھلی کی طرح پھسل جاتیں۔ پھر وہ کھسیا کر رہ جاتے۔ جیسے تخیل میں وہ شبنم ہی کو اٹھا رہے تھے اور بھابی کٹی گائے کی طرح نادم ہو کر فوراً" پڈنگ یا کوئی اور مزے دار ڈش تیار کرنے چلی جاتیں۔ اس وقت جو انہیں پانی میں دھکیلا گیا تو وہ گٹھڑی کی طرح لڑھک گئیں۔ ان کے کپڑے جسم پر چپک گئے اور ان کے جسم کا سارا بھونڈا پن بھیانک طریقہ پر ابھر آیا۔ کمر پر جیسے کسی نے توشک لپیٹ دی تھی۔ کپڑوں میں وہ اتنی بھیانک نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

"اوہ کتنی موٹی ہو گئی ہو تم"۔ بھیا نے ان کے کولہے کا بوٹا پکڑ کر کہا۔ اف توند تو دیکھو۔۔۔۔ بالکل گاما پہلوان معلوم ہو رہی ہو"۔

"ہنہ چار بچے ہونے کے بعد کمر۔۔۔۔"

"میرے بھی تو چار بچے ہیں۔۔۔۔ میری کمر تو ڈنلو پلو کا گدا نہیں بنی" انہوں نے اپنے سڈول جسم کو ٹھوک بجا کر کہا اور بھابی منہ تھوتھائے بھیگی مرغی کی طرح پیر

مارتی جھرجھریاں لیتی ریت میں گہرے گہرے گڑھے بناتی منے کو گھسیٹتی چلی گئیں۔ بھیا بالکل بے توجہ ہو کر شبنم کو پانی میں ڈبکیاں دینے لگے۔ مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ ایسا اڑنگا لگایا کہ غڑاپ سے اوندھے منہ گر پڑے۔

جب نہا کر آئے تو بھابی سر جھکائے خوبانیوں کے مربہ پر کریم کی تہہ جما رہی تھیں، ان کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ گٹارچہ کی گڑیاں جیسے موٹے موٹے گال اور سوجے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

لنچ پر بھابی بے انتہا غمگین تھیں۔ لہٰذا بڑی تیزی سے خوبانیوں کا مربہ اور کریم کھانے پر جٹی ہوئی تھیں۔ شبنم نے ڈش کی طرف دیکھ کر ایسے پھریری لی جیسے خوبانیاں نہ ہوں سانپ بچھو ہوں۔

"زہر ہے زہر!" اس نے نفاست سے ککڑی کا ٹکڑا کترتے ہوئے کہا۔ اور بھیا بھابی کو گھورنے لگے۔ مگر وہ شپاشپ مربہ اڑاتی رہیں۔

"حد ہے!" انہوں نے نتھنے پھڑکا کر کہا۔

بھابی نے کوئی دھیان نہ دیا اور قریب قریب پوری ڈش پیٹ میں انڈیل لی۔ انہیں مربہ سپوڑتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رشک و حسد کے طوفان کو روکنے کے لئے بند باندھ رہی ہوں۔ یہ کریم چوبی کی چٹانوں کی صورت میں ان کے جسم کے قلعے کو ناقابل تسخیر بنا دے گی۔ پھر شاید دل میں یوں ٹیسیں نہ اٹھیں گی۔ بھیا جی اور شبنم کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ٹکراؤ سے بھڑکنے والے شعلے ان پتھریلی دیواروں کو نہ پگھلا سکیں گے۔

"خدا کے لئے بس کرو۔۔۔۔ ڈاکٹر بھی منع کر چکا ہے ایسا بھی کیا چٹورپن"۔ بھیا نے کہہ ہی دیا، موم کی دیوار کی طرح بھابی پگھل گئیں۔ بھیا کا نشتر چربی کی دیواروں کو چیرتا ہوا ٹھیک دل میں اتر گیا۔ موٹے موٹے آنسو بھابی کے پھولے ہوئے گالوں پر پھسلنے لگے۔ سسکیوں نے جسم کے ڈھیر میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ دبلی پتلی اور نازک لڑکیاں کس لطیف اور سہانے انداز میں روتی ہیں۔ مگر بھابی کو روتے دیکھ کر بجائے دکھ کے ہنسی آتی تھی جیسے کوئی روئی کے بھیگے ہوئے ڈھیر کو ڈنڈوں سے

پیٹ رہا ہو۔

وہ ناک پونچھتی ہوئی اٹھنے لگیں مگر ہم لوگوں نے روک لیا اور بھیا کو ڈانٹا خوشامد کر کے واپس انہیں بٹھا لیا۔ بیچاری ناک سڑکاتی بیٹھ گئیں۔ مگر جب انہوں نے کافی میں تین چمچ شکر ڈال کر کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک دم ٹھٹھک گئیں۔ سہمی ہوئی نظروں سے شبنم اور بھیا کی طرف دیکھا۔ شبنم بمشکل اپنی ہنسی روکے ہوئے تھی بھیا مارے غصہ کے روہانسے ہو رہے تھے۔ وہ ایک دم بھنا کر اٹھے اور جا کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حالات اور بگڑے۔ بھابی نے کھلم کھلا اعلان جنگ کر دیا۔ کسی زمانے میں بھابی کا پٹھانی خون بہت گرم تھا۔ ذرا سی بات پر ہاتھا پائی پر اتر آیا کرتی تھیں اور بارہا بھیا سے غصہ ہو کر بجائے منہ پھیلانے کے وہ خونخوار بلی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑتیں ان کا منہ کھسوٹ ڈالتیں۔ دانتوں سے گریبان کی دھجیاں اڑا دیتیں۔ پھر بھیا انہیں اپنی بانہوں میں جڑ کر بے بس کر دیتے اور وہ ان کے سینے سے لگ کر پیاسی ڈری ہوئی چڑیا کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں پھر ملاپ ہو جاتا اور جھینپی کھسیانی وہ بھیا کے منہ پر لگے ہوئے کھرونچوں پر پیار سے ٹنکچر لگا دیتیں۔ ان کے گریبان کو رفو کر دیتیں۔ اور میٹھی میٹھی شکر گزار آنکھوں سے انہیں تکتی رہتیں۔

یہ تب کی بات ہے جب بھابی ہلکی پھلکی تیتری کی طرح طرار تھیں لڑتی ہوئی چھوٹی سی پشمی بلی معلوم ہوتی تھیں۔ بھیا کو ان پر غصہ آنے کے بجائے اور شدت سے پیار آتا۔ مگر جب ان پر گوشت نے جہاد بول دیا تھا۔ وہ بہت ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ انہیں اول تو غصہ ہی نہ آتا اور اگر آتا بھی تو فوراً" ادھر ادھر کام میں لگ کر بھول جاتیں۔

اس دن انہوں نے اپنے بھاری بھرکم ڈیل کو بھول کر بھیا پر حملہ کر دیا بھیا صرف ان کے بوجھ سے دھکا کھا کر دیوار سے جا چپکے۔ روئی کے گٹھڑ کو یوں لڑھکتے دیکھ کر انہیں سخت گھن آئی۔ نہ غصہ ہوئے، نہ بگڑے، شرمندہ اداس سر جھکائے کمرے سے نکل بھاگے۔ بھابی وہیں پسر کر رونے لگیں۔

بات اور بڑھی اور ایک دن بھیا کے سالے آکر بھابی کو لے گئے۔ طفیل بھابی کے چچا زاد بھائی تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ بچوں کی طرح ان سے لپٹ کر رونے لگیں۔ انہوں نے بھابی کو پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ وہ گول گیند کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے سٹ پٹائے پھر انہوں نے بھابی کو ننھی بچی کی طرح سینے سے لگا لیا۔ بھیا اس وقت شبنم کے ساتھ کرکٹ کا میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے طفیل نے شام تک ان کا انتظار کیا۔ وہ نہ آئے تو مجبوراً" بھابی اور بچوں کا سامان تیار کیا گیا۔

جانے سے پہلے بھیا گھڑی بھر کو کھڑے کھڑے آئے۔

"دہلی کے مکان میں نے ان کے مہر میں دیئے"۔ انہوں نے رکھائی سے طفیل سے کہا۔

"مہر؟" بھابی تھر تھر کانپنے لگی"۔

"ہاں---- طلاق کے کاغذات وکیل کے ذریعہ پہنچ جائیں گے۔"

"مگر طلاق---- طلاق کا کیا ذکر ہے۔؟"

"اسی میں بہتری ہے"۔

"مگر---- بچے---- ؟"

"یہ چاہیں تو انہیں لے جائیں---- ورنہ میں نے بورڈنگ میں انتظام کرلیا ہے"۔

ایک چیخ مار کر بھابی بھیا پر جھپٹیں--- مگر انہیں کھسوٹنے کی ہمت نہ پڑی سہم کر ٹھٹھک گئیں۔

اور پھر بھابی نے اپنی نسوانیت کی پوری طرح بے آبروئی کرڈالی۔ وہ بھیا کے پیروں پر لوٹ گئیں ناک رگڑ ڈالی۔

"تم اس سے شادی کرلو---- میں کچھ نہ کہوں گی۔ مگر خدا کے لئے مجھے طلاق نہ دو۔ میں یوں ہی زندگی گزار دوں گی۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی"۔

مگر بھیا نے نفرت سے بھابی کے تھل تھل کرتے ہوئے جسم کو دیکھا اور منہ موڑ لیا۔

"میں طلاق دے چکا۔ اب ---- کیا ہو سکتا ہے"۔
مگر بھابی کو کون سمجھاتا۔ وہ بلبلائے چلی گئیں۔
"بے وقوف ---" طفیل نے ایک ہی جھٹکے میں بھابی کو زمین سے اٹھا لیا۔
"گدھی کہیں کی، چل اٹھ" ---- اور وہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔
کیا دردناک سماں تھا۔ بچے پھوٹ پھوٹ کر رونے میں ہم بھابی کا ساتھ دے رہے تھے۔ اماں خاموش ایک ایک کا منہ تک رہی تھیں۔ ابا کی موت کے بعد ان کی گھر میں کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ بھیا خود مختار تھے بلکہ ہم سب کے سرپرست تھے۔ اماں انہیں بہت سمجھا کر ہار چکی تھیں انہیں اس دن کی اچھی طرح خبر تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔
بھابی چلی گئیں ---- فضا ایسی خراب ہوگئی تھی کہ بھیا اور شبنم بھی شادی کے بعد ہل اسٹیشن پر چلے گئے۔

ساتھ آٹھ سال گزر گئے کچھ کم و بیش ٹھیک اندازہ نہیں ہم سب اپنے اپنے گھروں کی ہوئیں۔ اماں کا انتقال ہوگیا۔ ابا کی موت کے بعد وہ بالکل گم سم ہو کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے بھابی کی طلاق پر بہت رونا پیٹنا مچایا۔ مگر بھیا کے مزاج سے وہ واقف تھیں۔ وہ کبھی ابا کی بھی نہیں سنتے تھے۔ کماؤ پوت اپنا مالک ہوتا ہے۔
آشیانہ اجڑ گیا۔ بھرا ہوا گھر سنسان ہوگیا۔ سب ادھر ادھر اڑ گئے سات آٹھ سال آنکھ جھپکتے نہ جانے کہاں گم ہوگئے کبھی سال دو سال میں بھیا کی کوئی خیر خبر مل جاتی۔ وہ زیادہ تر ہندوستان سے باہر ملکوں کی چک پھریوں میں الجھے رہے مگر جب ان کا خط آیا کہ وہ بمبئی آرہے ہیں تو بھولا بسرا بچپن پھر سے جاگ اٹھا۔ بھیا جی ٹرین سے اترے تو ہم دونوں بچوں کی طرح لپٹ گئے۔ شبنم مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ ان کا سامان اتر رہا تھا۔ جیسے ہی بھیا سے اس کی خیریت پوچھنے کو مڑی، دھپ سے ایک وزنی ہاتھ میری پیٹھ پر پڑا اور کئی من کا گرم گرم گوشت کا پہاڑ مجھ سے لپٹ گیا۔

"بھابی!" میں نے پلیٹ فارم سے نیچے گرنے سے بچنے کے لئے کھڑکی میں جھول کر کہا۔ زندگی میں میں نے شبنم کو کبھی بھابی نہ کہا تھا۔ وہ لگتی بھی تو شبنم ہی تھی مگر آج میرے منہ سے بے اختیار بھابی نکل گیا۔ شبنم کی پھوار۔۔۔ ان چند سالوں میں گوشت اور پوست کا تھودا کیسے بن گئی؟ میں نے بھیا کی طرف دیکھا وہ ویسے ہی دراز قد اور چھریرے تھے۔ ایک تولہ گوشت نہ ادھر نہ ادھر وہی کم سن لڑکوں جیسے گھنے بال۔ بس دو چار سفید چاندی کے تار کنپٹیوں پر جھانکنے لگے تھے جن سے وہ اور بھی حسین اور باوقار معلوم ہونے لگے تھے۔ ویسے کے ویسے چٹان کی طرح جمے ہوئے تھے۔ لہریں تڑپ تڑپ کر چٹان کی اور لپکتی ہیں۔ اپنا سر اس کے قدموں میں دے مارتی ہیں۔۔۔ پاش پاش ہو کر بکھر جاتی ہیں' معدوم ہو جاتی ہیں۔ ہار تھک کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ کچھ وہیں اس کے قدموں میں دم توڑ دیتی ہیں اور نئی لہریں پھر سر فروشی کے ارادے سمیٹے چٹان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

اور چٹان۔۔۔؟ ان سجدوں سے دور۔۔۔ طنز سے مسکراتا رہتا ہے۔ اٹل' لاپرواہ اور بے رحم! جب بھیا نے شبنم سے شادی کی تو سب ہی نے کہا تھا۔۔۔ شبنم آزاد لڑکی ہے' پکی عمر کی ہے۔۔۔ بھابی۔۔۔ تو یہ میں نے شہناز کو ہمیشہ بھابی ہی کہا۔ ہاں تو شہناز بھولی اور کم سن تھی۔۔۔ بھیا کے قابو میں آگئی۔ یہ ناگن انہیں ڈس کر بے سدھ کر دے گی۔ انہیں مزہ چکھائے گی۔

مگر مزہ تو لہروں کو صرف چٹان ہی چکھا سکتی ہے۔

"بچے بورڈنگ میں چھٹی نہیں تھی۔ ان کی۔۔۔ شبنم نے کھٹی ڈکاروں بھری سانس میری گردن پر چھوڑ کر کہا۔

اور میں حیرت سے اس گوشت کے ڈھیر میں اس شبنم کی پھوار کو ڈھونڈ رہی تھی جس نے شہناز کے پیار کی آگ کو بجھا کر بھیا کے کلیجے میں نئی آگ بھڑکا دی تھی۔ مگر یہ کیا؟ بجائے اس آگ میں بھسم ہو جانے کے بھیا تو اور بھی سونے کی طرح تپ کر نکھر آئے تھے۔ آگ خود اپنی تپش میں بھسم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن گئی تھی۔ بھابی تو مکھن کا ڈھیر تھی۔۔۔ مگر شبنم تو جھلسی ہوئی مٹیالی راکھ تھی۔۔۔

اس کا سانولا کندنی رنگ مری ہوئی چھپکلی کے پیٹ کی طرح اور زرد ہو چکا تھا- وہ شربت گھلی ہوئی آنکھیں گدلی اور بے رونق ہو گئی تھی پتلی ناگن جیسی لچکتی ہوئی کمر کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا- وہ مستقل طور پر حاملہ معلوم ہوتی تھی- وہ نازک نازک چمکیلی شاخوں جیسی بانہیں مگدر کی طرح گاؤ دم ہو گئی تھیں- اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ پاؤڈر تھپا ہوا تھا- آنکھیں مسکارہ سے لتھڑی ہوئی تھیں- بھنویں شاید غلطی سے زیادہ نچ گئی تھیں- جبھی اتنی گہری پنسل گھسنا پڑی تھی-

بھیا رنز میں ٹھہرے- رات کو ڈنر پر ہم وہیں پہنچ گئے-

کیبرے اپنے پورے عروج پر تھا- مصری حسینہ اپنے چھاتی جیسے پیٹ کو مروڑیاں دے رہی تھی- اس کے کولہے دائروں میں لچک رہے تھے--- سڈول مرمریں بازو ہوا میں تھرتھرا رہے تھے---- باریک شفان میں سے اس کی روپہلی ٹانگیں ہاتھی دانت کے تراشے ہوئے ستونوں کی طرح پھڑک رہی تھیں---- بھیا کی بھوکی آنکھیں اس کے جسم پر بچھوؤں کی طرح رینگ رہی تھی---- وہ بار بار اپنی گدی پر انجانی چوٹ سہلا رہے تھے-

بھابی---- جو کبھی شبنم تھی---- مصری رقاصہ کی طرح لہرائی ہوئی بجلی تھی- جو ایک دن بھیا کے حواس پر گری تھی- آج ریت کے تودے کی طرح بھسکی بیٹھی تھی- اس کے موٹے موٹے گال خون کی کمی اور مستقل بدہضمی کی وجہ سے ممی کی طرح زردی مائل سبز ہو رہے تھے- نیان لائٹس کی روشنی میں اس کا رنگ دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا- جیسے کسی انجانے ناگ نے ڈس لیا ہو- مصری رقاصہ کے کولہے طوفان برپا کر رہے تھے اور بھیا جی کے دل کی ناؤ اس بھنور میں چک پھیریاں کھا رہی تھی' پانچ بچوں کی ماں شبنم--- جو اب بھابی بن چکی تھی' سہمی سہمی نظروں سے انہیں تک رہی تھی دھیان بٹانے کے لئے وہ تیزی سے بھنا ہوا مرغ ہڑپ کر رہی تھی-

آرکسٹرا نے ایک بھرپور سانس کھینچی---- ساز کرہے---- ڈرم کا دل گونج اٹھا- مصری رقاصہ کی کمر نے آخری جھکولے لئے اور نڈھال ہو کر مرمریں

فرش پر پھیل گئی۔
ہال تالیوں سے گونج رہا تھا---- شبنم کی آنکھیں بھیا جی کو ڈھونڈ رہی تھیں---- بیرا تر و تازہ رس بھری اور کریم کا جگ لے آیا۔ بے خیالی میں شبنم نے پیالہ رس بھریوں سے بھر لیا---- اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ آنکھیں چوٹ کھائی ہوئی ہرنیوں کی طرح پریشان چوکڑیاں بھر رہی تھیں۔
بھیڑ بھاڑ سے دور---- نیم تاریک بالکنی میں بھیا کھڑے مصری رقاصہ کا سگریٹ سلگا رہے تھے۔ ان کی پر شوق نگاہیں رقاصہ کی نشیلی آنکھوں سے الجھ رہی تھیں۔ شبنم کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ ایک بے ہنگم پہاڑ کی طرح گم سم بیٹھی تھی۔ شبنم کو اپنی طرف تکتا دیکھ کر بھیا رقاصہ کا بازو تھامے اپنی میز کی طرف لوٹ آئے اور ہمارا تعارف کرایا۔
"میری بہن" انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ رقاصہ نے لچک کر میرے وجود کو مان لیا۔
"میری بیگم"---- انہوں نے ڈرامائی انداز میں کہا---- جیسے کوئی میدان جنگ میں کھایا ہوا زخم کسی کو دکھا رہا ہو۔ رقاصہ دم بخود رہ گئی۔ جیسے اس نے اس کی رفیقہ حیات کو نہیں خود ان کی لاش کو خون میں غلطاں دیکھ لیا ہو' وہ ہیبت زدہ ہو کر شبنم کو گھورنے لگی۔ پھر اس نے اپنے کلیجے کی ساری ممتا اپنی آنکھوں میں سمو کر بھیا کی طرف دیکھا اس کی ایک نظر میں لاکھوں فسانے پوشیدہ تھے۔ "اف یہ ہندوستان جہاں جہالت سے کیسی کیسی پیاری ہستیاں رسم و رواج پر قربان کی جاتی ہیں۔ قابل پرستش ہیں وہ لوگ اور قابل رحم بھی جو ایسی ایسی "سزائیں" بھگتتے ہیں"۔
"شبنم میری بھابی نے رقاصہ کی نگاہوں میں یہ سب کچھ پڑھ لیا۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ پریشانی چھپانے کے لئے اس نے کریم کا جگ اٹھا کر رسبھریوں پر انڈیل دیا اور جٹ گئی۔
بیچارے بھیا جی! ہینڈ سم اور مظلوم---- سورج دیوتا کی طرح حسین اور

رو مشک شہد بھری آنکھوں والے بھیا جی چٹان کی طرح اٹل---- ایک امر شہید کا روپ سجائے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

ایک لہر چور چور ان کے قدموں میں پڑی دم توڑ رہی تھی۔

دوسری نئی نویلی لچکتی ہوئی لہر ان کی پتھریلی بانہوں میں سمانے کے لئے بے چین اور بے قرار تھی۔
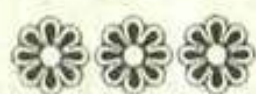
امر بیل

بڑی ممانی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ سارے خاندان کو شجاعت ماموں کی دوسری شادی کی فکر ڈسنے لگی۔ اٹھتے بیٹھتے دلہن تلاش کی جانے لگی۔ جب کبھی کھانے پینے سے نمٹ کر بیویاں بیٹوں کی بری یا بیٹیوں کا جہیز ٹانکنے بیٹھتیں تو ماموں کے لئے دلہن تجویز کی جانے لگتی۔

"ارے اپنی کنیز فاطمہ کیسی رہیں گی؟"

"اے ہے بی' گھاس تو نہیں کھا گئی ہو' کنیز فاطمہ کی ساس نے سن لیا تو ناک چوٹی کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ دیں گی۔ جوان بیٹے کی میت اٹھتے ہی وہ بہو کے گرد کنڈل ڈال کے بیٹھ گئیں۔ وہ دن اور آج کا دن دہلیز سے قدم نہ اتارنے دیا۔ نگوڑی کا میکے میں کوئی مرا جیتا ہوتا تو شاید کبھی آنا جانا ہو جاتا"۔

"اور بھئی تجن بھیا کو کیا کنواری نہیں ملے گی جو جھوٹ پتل چاٹیں گے۔ لوگ بیٹیاں تھال میں سجا کے دینے کو تیار ہیں۔ چالیس کے تو لگتے بھی نہیں"۔ اصغری خانم بولیں۔

"اوئی خدا خیر کرے! بوا پورے دس سال نگل رہی ہو! اللہ رکھے خالی کے مہینے میں پورے پچاس بھر کے....."

اللہ! بے چاری امتیازی پھپو بول کے پچھتائیں۔ شجاعت ماموں کی پانچ بہنیں ایک طرف اور وہ نگوڑی ایک طرف۔ اور ماشاء اللہ سے پانچوں بہنوں کی زبانیں بس کندھوں پر پڑی تھیں' یہ گز گز بھر کی۔ کوئی مچیا ہو جاتا بس پانچوں ایک دم مورچہ باندھ کے ڈٹ جاتیں۔ پھر مجال ہے جو کوئی مغلانی' پٹھانی تک میدان میں ٹک جائے۔ بے چاری شیخانیوں سیدانیوں کی تو بات ہی نہ پوچھئے---- بڑی بڑی دل گردے والیوں کے چھکے چھوٹ جاتے۔

مگر امتیازی پھپھو بھی ان پانچ پانڈوں پر سو کوروؤں سے بھاری پڑتیں۔ ان کا سب سے خطرناک حربہ ان کی چنچناتی ہوئی برمے کی نوک جیسی آواز تھی۔ بولنا جو شروع کرتیں تو ایسا لگتا جیسے مشین گن کی گولیاں ایک کان سے گھستی ہیں اور دوسرے کان سے زن سے نکل جاتی ہیں۔ جیسے ہی ان کی کسی سے تکرار شروع ہوتی سارے محلے میں ترنت خبر دوڑ جاتی کہ بھائی امتیازی بوا کی کسی سے چل پڑی' اور بیویاں کوٹھے لانگتی' چھجے پھلانگتی دنگل کی جانب ہلہ بول دیتیں۔

امتیازی پھپھو کی پانچوں بہنوں نے وہ ٹانگ لی کہ غریب نکو بن گئیں ان کی سنجھلی بیٹی گوری خانم اب تک کنواری دھری تھیں۔ چھتیسواں سال چھاتی پر سوار تھا مگر کہیں نصیب بننے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ کنوارے ملتے نہیں' بیاہے رنڈوے نہیں ہوتے۔ پہلے زمانے میں تو ہر مرد تین چار کو ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ مگر جب سے یہ ہسپتال اور ڈاکٹر پیدا ہوئے ہیں' بیویوں نے مرنے کی قسم کھا لی ہے' جیسے دیکھو عاقبت کے بوریئے پر تلی ہوئی ہے۔ بڑی ممانی کی بیماری کے دنوں میں ہی امتیازی پھپھو نے حساب لگا لیا تھا۔ لیکن ان کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ تھا کہ دوہاجو کیلئے بھی کنویں میں بانس ڈالنے پڑیں گے۔

شجاعت ماموں کی عمر کا مسئلہ بڑی نازک صورت اختیار کر گیا۔ قمر آراء اور نور خالہ کیلئے تو وہ ابھی لڑکا ہی تھے۔ اس لئے وہ تو مارے ہول کے برسوں کی گنتی میں بار بار گھپلا ڈال دیتیں۔ کیوں کہ ان کی عمر کا حساب لگ جانے سے خود خالاؤں کی عمر پر شہ پڑتی تھی' لہٰذا پانچوں بہنیں بالکل مختلف سمت سے حملہ آور ہوئیں۔ انہوں نے فوراً امتیازی پھپھو کے نواسہ داماد کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس کا تذکرہ پھپھو کی دکھتی رگ تھا' کیونکہ وہ ان کی نواسی پر سوت لے آیا تھا۔

مگر ہماری پھپھو بھی کھری مغلانی تھیں' جن کے والد شاہی فوج میں برق انداز تھے۔ وہ کہاں مار کھانے والیوں میں سے تھیں۔ جھٹ پینترا بدل کر وار خالی دیا اور شہزادی بیگم کی پوتی پر ٹوٹ پڑیں جو کھلے بندوں خاندان کی ناک کٹوا رہی تھی' کیونکہ وہ روز ڈولی میں بیٹھ کر دھنکوٹ کے اسکول میں پڑھنے جایا کرتی تھی۔ اس زمانے

میں اسکول جانا اتنا ہی بھیانک سمجھا جاتا تھ جتنا آج کل کوئی فلموں میں ناچنے گانے لگے۔

شجاعت ماموں بڑے معقول آدمی تھے۔ نہایت ستھرا نقشہ' چھریرا بدن' درمیانہ قد' امتیازی پھپھو سارے میں کہتی پھرتی تھیں کہ خضاب لگاتے ہیں' مگر آج تک کسی نے کوئی سفید بال ان کے سر میں نہیں دیکھا' اس لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ خضاب لگانا کب شروع کیا۔۔۔۔ یوں دیکھنے میں بالکل جوان لگتے تھے' واقعی چالیس کے نہیں جچتے تھے۔ جب ان پر پیغاموں کی بہت زور کی بارش ہوئی تو بوکھلا کر انہوں نے معاملہ بہنوں کے سپرد کر دیا' اتنا کہہ دیا' لونڈیا اتنی چھچھوری نہ ہو کہ بیٹی لگے' اور ایسی کھوسٹ بھی نہ ہو کہ ان کی اماں لگے۔

"اوئی' کیا خوفیاتا ہوا نام!" امتیازی پھپھو کو کچھ نہ سوجھا تو نام ہی میں کیڑے نکالنے لگیں' مگر بہنوں نے ایسا مورچہ کسا کہ ان کی کسی نے نہ سنی۔

"لونڈیا سولہ سے ایک دن زیادہ کی ہو تو سو جوتے صبح' سو جوتے شام' اوپر سے حقہ کا پانی"۔ مگر ان کی کسی نے نہ سنی۔ وہ اپنی گوری بیگم کی ناؤ پار لگانے کیلئے خواہی نہ خواہی دند مچاتی تھیں۔

رخسانہ بیگم تھیں کہ بس کوئی دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔ جیسے پہلی کا نازک شرمایا ہوا چاند کسی نے اتار لیا ہو۔ شکل دیکھتے جاؤ پر جی نہ بھرے۔ تولو تو پانچویں کے بعد چھٹا پھول نہ چڑھے۔ رنگت ایسی جیسے دمکتا کندن۔۔۔۔ جسم میں ہڈی کا نام نہیں جیسے سخت میدے کی لوئی پر گائے کا مکھن چپڑ دیا ہو۔ نسوانیت اس غضب کی جیسے درجن بھر عورتوں کا ست نچوڑ کر بھر دیا ہو۔ گرم گرم لپٹیں سی نکلتی تھیں' شاید بقول پھپھو سولہ برس کی ہوں گی' مگر انیس بیس کی اٹھان تھی' بہنوں نے ماموں کو پچیسواں سال بتایا تھا۔ انہیں ذرا سا تکلف تو ہوا مگر پھر ٹال گئے' کمسنی تو کوئی بڑا جرم نہیں۔

سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ بے انتہا مفلس گھر کا بوجھ تھیں۔ دونوں طرف کا خرچہ ماموں کے سر رہا۔ جب رخسانہ ممانی بیاہ کر آئیں تو انہیں غور سے

دیکھ کے ماموں کے پسینے چھوٹ گئے۔

"باجی' یہ تو بالکل بچی ہے!" انہوں نے بوکھلا کر کہا۔

"اوئی خدا خیر کرے! اے میاں تیل دیکھو' تیل کی دھار دیکھو۔

مرد ساٹھا اور پاٹھا۔ بیوی بیسی اور کھیسی۔ دو چار بچے ہوئے نہیں کہ ساری قلعی اتر جائے گی۔ گو موئی میں نہ سولہ سنگھار رہیں گے' نہ یہ رنگ و روغن نہ یہ چھلا سی کمر رہے گی۔ نہ بازوؤں کا لوچ۔ برابر کی نہ لگنے لگے تو چور کا حال سو میرا۔ میں تو کہوں دس سال میں بڑی بھابی جان کی طرح ہو جائے گی"۔

"پھر ہم اپنے بیرن کیلئے ساڑھے بارہ برس کی لائیں گے"۔ خالہ چہکیں۔

"ہشت!" ماموں شرما گئے۔

"دوسری بیوی نہیں جیتی' اس لئے تیسری"۔ شمسہ بیگم بولیں۔

"کیا بک رہی ہو؟"

"ہاں میاں بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں۔ دوسری تو تیسری کا صدقہ ہوتی ہے' اسی لئے پرانے زمانے میں لوگ دوسری شادی گڑیا سے کر دیا کرتے تھے۔ تاکہ پھر جو دلہن آئے وہ تیسری ہو"۔

بہنوں نے سمجھایا اور ماموں سمجھ گئے۔ پھر جلد ہی رخسانہ بیگم نے بھی سمجھا دیا۔ دو تین سال میں اچھے کھانے کپڑے اور عاشق زار میاں نے وہ جادو پھیرا کہ پہلی کا چاند چودھویں کا ماہتاب ہو گیا' وہ چاندنی چٹکی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک گئیں۔ پور پور سے شعاعیں پھوٹ نکلیں---- شجاعت ماموں پر ایسا نشہ سوار ہوا کہ بالکل دھت ہو گئے۔ شکر ہے جلد ہی پنشن ہونے والی تھی' ورنہ آئے دن کے دفتر سے غوطے ضرور رنگ لاتے۔

بہنوں کے لے دے کے ایک بھیا تھے۔ بڑی ممانی تو دلہاپے ہی میں جی سے اتر گئی تھیں۔ ان کی کمان کبھی چڑھی ہی نہیں۔ جب تک زندہ رہیں صورت کو ترستی رہیں۔ آل اولاد خدا نے دی ہی نہیں کہ ادھر جی بہل جاتا۔ میاں بہنوں کے چہیتے بھائی۔ صورت نہ دیکھیں تو کھانا نہ پچے۔ دفتر سے سیدھے کسی بہن کے یہاں

پہنچتے' رات کا کھانا وہیں سے کھا کر آتے۔ پھر بھی روزانہ خوان سجائے رات تک بیٹھی راہ تکا کرتیں' کسی دن اتفاق سے کھا لیتے تو ان کی زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا۔ آئے دن بہنوں کے ہاں ہنگامے رہتے۔ جھوٹوں کو کبھی بھاوج کو بھی بلا لیتیں مگر یہ بے چاری وہاں غریب الوطن سی لگتیں۔ سب نے بلانا چھوڑ دیا۔ شجاعت ماموں کو کبھی یار دوستوں کی دعوت کرنی ہوتی یا قوالی اور مجرے کی محفلیں جمتیں تو بیوی کو پتہ بھی نہ چلتا' بہنیں سب انتظام کر دیتیں' یہ ان ہی کے ہاتھ میں روپیہ دے دیتے۔

کسی نے ممانی کو رائے دی کہ میاں کو قابو کرنے کا بس ایک گر ہے اسے ایسے کھانے کھلاؤ کہ کسی کے گھر کا نوالہ منہ کو نہ لگے۔ بس جی' ممانی نے کھانا پکانے کی کتابیں منگائیں' لہسن کی کھیر اور بادام کے گلگلے' دم کا مرغ اور مچھلی کے کباب پکائے جنہیں کھا کر ماموں نے فیصلہ کیا کہ وہ انہیں زہر دے کر مارنا چاہتی ہیں۔

ممان خون تھوک کر مر گئیں۔

مگر نئی نویلی کا جادو تو آتے ہی سر چڑھ کر بولنے لگا۔ نہ کہیں آنے کے رہے نہ جانے کے' نہ کسی کا آنا بھائے۔ بس میاں ہیں اور بیوی۔ کیا باغ و بہار سا بھائی چٹکی بجاتے میں کھرے ان کی طرح بے رحم اور بے مروت ہو گیا! دنیا اجاڑ ہو گئی۔ اپنے پاؤں آپ کلہاڑی ماری۔ گوری بیگم سے شادی کرا دی ہوتی تو یوں بھیا صاحب القط نہ ہو جاتے۔

"اے بھابی بھیّا کو آنچل میں کب تک باندھے رکھو گی؟ مرد ذات ہے کوئی جھنڈلنا نہیں کہ ہر دم کولہے سے لگائے بیٹھی ہیں"۔

لاکھ طعنے دیئے جاتے' دلہن بیگم ہیں کہ کھی کھی ہنس رہی ہیں اور میاں کاٹھ کے الو کھکھیائے جاتے ہیں' اپنی جورو ہے کوئی پڑوسی کی نہیں کہ بس تکے جا رہے ہیں بجر بٹو کی طرح۔

ماموں وہ ماموں ہی نہ رہے۔ اجی کیسی قوالیاں اور کیسے مجرے بس بیوی تگنی

کا ناچ نچا رہی ہے' آپ ناچ رہے ہیں۔

"اے بس' اور تھوڑے دن کے چونچلے ہیں' پیر بھاری ہوا نہیں کہ سارا دلہناپا ختم۔ ایک نہ ایک دن تو بھائی کا جی بھرے گا"۔ دلوں کو تسلی دی گئی۔۔۔۔۔

اللہ اللہ کر کے رخسانہ ممانی کا پیر بھاری ہوا تو اللہ توبہ! نہ الٹیاں نہ طبیعت ماندی۔ چہرے پہ اور چار چاند کھل اٹھے' کیا مجال جو ذرا سی آلکس آ جائے۔ وہی شوخیاں' وہی انداز معشوقانہ جو نئی دلہنوں کے ہوا کرتے ہیں۔ اور ماموں کا تو بس نہیں چلتا انہیں اٹھا کر پلکوں میں چھپا لیں۔ دل نکال کے قدموں میں ڈالے دیتے ہیں۔ جی سے اترنے کے بجائے وہ تو دماغ پر بھی چھا گئیں۔

پورے دنوں میں بھی رخسانہ ممانی کے حسن کو گہن نہ لگا۔ جسم پھیل گیا مگر چاند دمکتا رہا۔ نہ پیروں پر سوجن' نہ آنکھوں کے گرد حلقے' نہ چلنے پھرنے میں کوئی تکلیف۔

جاپے کے بعد چٹ سے کھڑی ہو گئیں۔ کیا مجال جو کمر بال برابر بھی موٹی ہوئی ہو' وہی کنواریوں جیسا لچک دار جسم' بھلی بیوی کے جاپے میں بال جھڑ جاتے ہیں' ان کے وہ ادبدا کے بڑھے کہ خود سر دھونا دشوار ہو گیا۔

ہاں بیوی کے بدلے ذرا ماموں جھٹک گئے' جیسے بچہ انہوں نے ہی پیدا کیا ہو۔ تھوڑی سی توند ڈھلک آئی۔ گالوں میں لمبی لمبی قاشیں گہری ہو گئیں' بال پہلے سے زیادہ سفید ہو گئے۔ اگر داڑھی نہ بنی ہوتی تو گالوں پر چیونٹی کے سفید سفید انڈے پھوٹ آتے۔

جب دو سال بعد بیٹی ہوئی تو ماموں کی توند اور آگے کھسک آئی۔ آنکھوں کے نیچے کھال لٹکنے لگی۔ نچلی ڈاڑھ کا درد قابو سے باہر ہو گیا تو مجبوراً" نکلوانا پڑی۔ ایک اینٹ کھسکی تو ساری عمارت کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔

ان دنوں ممانی کی عقل داڑھ نکل رہی تھی۔

شجاعت ماموں کی بتیسی اصلی دانتوں سے زیادہ حسین تھی۔ عمر کا الزام نزلہ کے سر گیا۔

امتیازی پھپھو کے حساب سے رخسانہ ممانی چھبیس برس کی تھیں۔ گو اب وہ کبھی بچوں کے ساتھ دھما چوکڑی مچانے کے موڈ میں آ جاتیں تو سولہ برس کی لگنے لگتیں۔ کئی سال سے عمر کا بڑھنا رک گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان کی عمر اڑیل ٹٹو کی طرح ایک جگہ جم گئی ہے اور آگے کھسکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ نندوں کے دل پر آرے چلتے۔ ویسے بھی جب اپنے ہاتھ پیر تھکنے لگیں تو نوجوانوں کی شوخیاں' منہ زور گھوڑے کی دولتی کی طرح کلیجے میں لگتی ہیں۔ اور ممانی تو صاف امانت میں خیانت کر رہی تھیں۔ شرافت اور بھل ملنساہٹ کا تو یہ تقاضا تھا کہ وہ شوہر کو اپنا خدائے مجازی سمجھتیں۔ اچھے برے میں ان کا ساتھ دیتیں۔ یہ نہیں کہ وہ تھکے ماندے بیٹھے ہیں اور بیگم بے تحاشا مرغیوں کے پیچھے دوڑ رہی ہیں۔

"اے بھابی' تم پر خدا کی سور' نہ سر کی خبر ہے نہ پیر کی' ہڑونگی بنی مرغیاں کھدیڑ رہی ہو!"

"اے تو کیا کروں خالہ' موئی بلی......"

"اوئی' لو اور سنو اے بی میں تمہاری خالہ کب سے ہو گئی؟ تجن بھائی مجھ سے چار سال بڑے ہیں ماشاء اللہ---- بڑا بھائی باپ برابر---- تم بھی میری بڑی ہو' خبردار جو تم نے پھر مجھے خالہ کہا"۔

"جی بہت اچھا....." شادی سے پہلے رخسانہ ممانی کی اماں ان کی دوپٹہ بدل بہن کہلاتی تھیں۔

وہی حسن اور کم سنی' جس نے ایک دن شجاعت ماموں کو غلام بنا لیا تھا' اب ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ لنگڑا بچہ جب دوسرے بچوں کے ساتھ نہیں دوڑ پاتا تو چڑھ کر مچل جاتا ہے کہ تم بے ایمانی کر رہے ہو۔ ممانی ان کے ساتھ دغا کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی تو انہیں لڑکیوں بالیوں کی طرح ہنستا یا دوڑتے بھاگتے دیکھ کر ان کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں' وہ جل کر کوئلہ ہو جاتے۔

"لونڈوں کو لبھانے کیلئے کیا تن تن کے چلتی ہو"۔ وہ زہر اگلنے لگے "ہاں اب کوئی جوان پٹھا ڈھونڈ لو"۔

ممانی پہلے تو ہنس کر ٹال دیتیں، پھر جھینپ کر گلنار ہو جاتیں۔ اس پر ماموں اور بھی چراغ پا ہوتے اور بھاری بھاری الزام لگاتے۔

"فلاں سے آنکھیں لڑا رہی تھیں، ڈھماکے سے تمہارا تعلق ہے"۔

تب ممانی سناٹے میں رہ جاتیں۔ موٹے موٹے آنسو چھلک اٹھتے انگلی سے دوپٹہ گھسیٹ کر وہ اپنا جسم ڈھک کر سر جھکائے کمرے میں چلی جاتیں۔ ماموں کا کلیجہ کٹ جاتا، ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک جاتی وہ ان کے تلوے چومتے، ان کے قدموں میں سر پھوڑتے، ان کے آگے ناک رگڑتے، رونے لگتے۔ "میں کمینہ ہوں، حرام زادہ ہوں، جوتی لے کر جتنے چاہو مارو۔ میری جان، میری رخی، میری ملکہ، شہزادی"۔

اور رخسانہ ممانی اپنی روپہلی باہیں ان کے گلے میں ڈال کر بھوں بھوں روتیں۔

"تمہارا عاشق زار ہوں میری جان۔ رشک و حسد سے جل جل کر خاک ہوا جاتا ہوں۔ تم تو ننھے کو گود میں لیتی ہو تو میرا خون کھولنے لگتا ہے، جی چاہتا ہے سالے کا گلا گھونٹ دوں، مجھے معاف کر دو میری جان"۔ وہ چھٹ معاف کر دیتیں۔ اتنا معاف کرتیں کہ شجاعت ماموں کی آنکھوں کے حلقے اور اودے ہو جاتے، اور وہ بڑی دیر تک تھکے ہوئے خچر کی طرح ہانپا کرتے۔

پھر ایسے بھی دن آ گئے کہ وہ معافی بھی نہ مانگ سکے۔ کئی کئی دن وہ روٹھے پڑے رہتے۔ بہنوں کی امیدیں بندھ جاتیں۔

"بھیا جان بھابی کو کڑھا کڑھا کے مار رہے ہیں۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ یہ آئے دن کی دانتا کل کل رنگ لائے گی"۔

ممانی چھپ چھپ کر گھنٹوں روتیں۔ آنسو بھری آنکھوں میں لال لال ڈورے اور بھی ستم ڈھانے لگتے۔ ستا ہوا زرد چہرہ جیسے سونے کی گنی میں کسی بے ایمان سنار نے چاندی کی ملاوٹ بڑھا دی ہو۔ پھیکے پھیکے ہونٹ ماتھے پر الجھی سی ایک وارفتہ لٹ۔ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے۔ حسن سوگوار کو دیکھ کر ماموں کے

کندھے اور جھک جاتے' آنکھوں کی ویرانی بڑھ جاتی۔

ایک بیل ہوتی ہے---- امر بیل۔ ہرے ہرے سنپولئے جیسے ڈنٹھل---- جڑ نہیں ہوتی---- یہ ہرے ڈنٹھل کسی بھی سر سبز پیڑ پر ڈال دئے جائیں تو بیل اس کا رس چوس کر پھلتی پھولتی ہے۔ جتنی یہ بیل پھیلتی ہے اتنا ہی وہ پیڑ سوکھتا جاتا ہے۔

جوں جوں رخسانہ بیگم کے چمن کھلتے جاتے تھے ماموں سوکھتے جاتے تھے۔ بہنیں سر جوڑ کر کھسر پھسر کرتیں۔ بھائی کی دن بدن گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر ان کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ بالکل جھرکٹ ہو گئے تھے۔ گٹھیا کی شکایت تو تھی ہی' نزلہ الگ عذاب جان ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا خضاب قطعی موافق نہیں۔ مجبوراً" مہندی لگانے لگے۔

بے چاری رخسانہ ایک ایک سے بال سفید کرنے کے نسخے پوچھتی پھرتی تھیں۔ کسی نے کہا اگر خوش بو دار تیل ڈالو تو بال جلدی سفید ہو جائیں گے۔ دکھیا نے عطر سر میں جھونک لیا۔ ماموں کی ناک میں جو شمامت العنبر کی مدہوش کن خوشبو کی لپٹیں پہنچیں تو وہ غلیظ عیب انہوں نے ممانی پر لگائے کہ اگر بچوں کا خیال نہ ہوتا تو ممانی کنویں میں کود جاتیں' ان کے بال سفید ہونے کی بجائے اور ملائم اور چمکدار ہو کر ڈسنے لگے۔

ممانی کی جوانی کے توڑ کیلئے ماموں نے طب یونانی کی تمام معجونیں' مقویات' کشتے اور تیل استعمال کر ڈالے۔ تھوڑے دن کیلئے ان کی بھاگتی ہوئی جوانی تھم گئی۔ بانکپن لوٹ آیا۔ ممانی نے کچھ دنیا داری کے داؤ پیچ تو سیکھے نہ تھے' خود رو پودا تھیں---- کبھی کسی نے باریکیاں نہ سمجھائیں۔ اٹھائیس سال کی تھیں مگر اٹھارہ برس جیسی ناتجربہ کار اور الھڑپن تھا۔

موٹر بہت چلاؤ تو انجن جل جاتا ہے دواؤں کا رد عمل جو شروع ہوا تو شجاعت ماموں ڈھے گئے۔ ایک دم بڑھاپا ٹوٹ پڑا۔ اگر وہ جسم اور دماغ کو اتنا نہ تھکاتے تو باسٹھ برس میں یوں لٹیا نہ ڈوب جاتی۔ اب وہ اپنی عمر سے زیادہ لگنے لگے۔

بہنیں زار و قطار روتیں، حکیم ڈاکٹر جواب دے چکے تھے لوگوں نے جوان بننے کے تو لاکھوں نسخے ایجاد کئے قبل از وقت بوڑھا ہونے کی کوئی دوا نہیں، جو ممانی کو کھلا دی جاتی۔ ضرور ان پر کوئی سدا بہار قسم کا جن یا پیر مرد عاشق تھا کہ کسی طور سے ان کی جوانی ڈھلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ تعویذ گنڈے ہار گئے، ٹونے ٹوٹکے چت ہو گئے۔

امر بیل پھیلتی رہی۔

برگد کا پیڑ سوکھتا رہا۔

تصویر ہو تو کوئی پھاڑ دے، مجسمہ ہو تو پٹخ کر چکنا چور کر دے۔ اللہ کے ہاتھوں کا بنایا مٹی کا پتلا، اگر حسین بھی ہو اور زندہ بھی، اس کی ہر سانس میں جوانی کی گرمی مہک رہی ہو تو پھر کچھ بس نہیں چلتا۔ اس کے چڑھتے ہوئے سورج کو اتارنے کی ایک ہی ترکیب ہو سکتی ہے کہ کھانے کی مار دی جائے۔ گھی، گوشت، انڈے، دودھ قطعی بند۔ جب سے شجاعت ماموں کا ہاضمہ جواب دے گیا تھا، ممانی صرف بچوں کیلئے گوشت وغیرہ منگاتی تھیں۔ کبھی کبھار ایک نوالہ خود چکھ لیتی تھیں، اب اس سے بھی پرہیز کر لیا۔ سب کو امید بندھ گئی کہ اب انشاء اللہ ضرور بڑھاپا تشریف لے آئے گا۔

"اے بھابی یہ کیا اچھال چھکا لونڈیوں کی طرح موئی شلوار قمیض پہنتی ہو، اور بھی ننھی بنی جاتی ہو"۔ نند کہتیں---- "بھاری بھرکم کپڑے پہنو کہ اپنی عمر کی لگو"۔

ممانی نے ٹکا ہوا دوپٹہ اور غرارہ پہن لیا۔

"کسی یار کی بغل میں جانے کی تیار ہے"۔ ماموں نے کچوکے دئے، ممانی کپڑوں سے بھی خوف کھانے لگیں۔

"اے بھی یہ کیا ایک آدھ وقت کی نماز پڑھتی ہو، پنج وقتہ کی عادت ڈالو"۔

ممانی پنج وقتہ نماز پڑھنے لگیں۔ جب سے ماموں کی نیند بوڑھی اور نخریلی ہوئی تھی، تہجد کے وقت سے جاگنا پڑتا تھا۔

"میرے مرنے کے نفل پڑھ رہی ہو"۔ ماموں بسورے۔

دبلی تو تھیں، دن رات کی دانتا کل کل سے اور بھی دھان پان ہو گئیں۔ گھی گوشت سے پرہیز ہوا تو رنگ اور بھی نتھر آیا، جلد ایسی شفاف ہو گئی کہ جیسے کوئی دم میں بلور کی طرح آر پار نظر آنے لگے گا۔ چہرے پر عجب نور سا اتر آیا۔ پہلے دیکھنے والوں کی رال ٹپکتی تھی، اب ان کے قدموں میں سر پٹخنے کی تمنا جاگنے لگی۔ جب صبح سویرے نماز فجر کے بعد قرآن کی تلاوت کرتیں تو ان کے چہرے پر حضرت مریم کا تقدس اور فاطمہ زہرہ کی پاکیزگی طاری ہو جاتی۔ وہ اور بھی کم سن اور کنواری لگنے لگتیں۔

ماموں کی قبر اور پاس کھسک آتی، اور وہ انہیں منہ بھر بھر کے کوستے اور گالیاں دیتے کہ بھانجوں بھتیجوں کے بعد وہ جنوں اور فرشتوں کو ورغلا رہی ہیں، چلے کھینچ کھینچ کر جن قابو میں کر لئے ہیں، ان سے جادو کی بوٹیاں منگا کر کھاتی ہیں۔

خضاب کے بعد اب مہندی بھی ماموں کو آنکھیں دکھانے لگی تھی مہندی لگاتے تو چھینکیں آکر نزلہ ہو جاتا۔ ویسے بھی انہیں مہندی سے گھن آنے لگی تھی۔ رخسانہ ممانی ان کے بالوں میں مہندی لگاتیں تو باوجود احتیاط کے ان ہاتھوں میں بھی شمعیں لو دینے لگتیں۔ ان کے ہاتھ دیکھ کر شجاعت ماموں کو ایسا معلوم ہوتا جیسے مہندی میں نہیں ممانی نے ان کے خون دل میں ہاتھ ڈبو لئے ہیں۔ وہی ہاتھ جنہیں وہ کبھی چنبیلی کی منہ بند کلیاں کہہ کر چوما کرتے تھے، آنکھوں سے لگاتے تھے، اب شکرے کے خوں خوار پنجوں کی طرح ان کی آنکھوں میں گھسے جاتے تھے۔

جتنا جتنا وہ ان کی منڈیا زمین پر گھستے، ممانی صندل کی طرح مہکتیں۔

بہنیں گھر سے تر مال تیار کر کے بھائی کو کھلانے لاتیں کہ کہیں بھاوج زہر نہ کھلا رہی ہو۔ اپنے ہاتھ سے سامنے کھلاتیں۔ مگر ان کھانوں سے ماموں کا حال اور پتلا ہو جاتا۔ بواسیر کی پرانی شکایت نے وہ زور پکڑا کہ رہا سہا خون بھی نچوڑ لیا۔ ابھی تک اس نامراد کشتے کا اثر باقی تھی، جو انہوں نے پچھلے جاڑوں میں مراد آباد کے ایک نامی گرامی حکیم صاحب کا نسخہ لے کر کئی سو کی لاگت سے تیار کرایا تھا۔ نسخہ

بے حد شاہی قسم کا تھا جسے مردہ کھالیتا تو تنتنا کر کھڑا ہو جاتا۔ مگر ماموں گوندنی کی طرح پھوڑوں سے لد گئے۔

دکھیا ممانی گھی کو سینکڑوں بار پانی سے دھوتیں۔ اس میں گندھک اور بہت سی دوائیں کوٹ چھان کر ملاتیں۔ دھڑیوں مرہم تھوپا جاتا' پتیلیوں میں نیم کے پتوں کا پانی اوٹاتیں اور صبح شام پیپ' خون دھوتیں' ان میں سے چند پھوڑے مستقل ناسور بن گئے تھے اور ماموں کو نگل رہے تھے۔

پھر ایک تو اندھیر ہی ہو گیا۔ ماموں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ بہنیں بیٹھی بھاوج کا دکھڑا رو رہی تھیں کہ نجی بڑھیا خدا جانے کہاں سے آن مری۔ پہلے تو وہ شجاعت ماموں کو نانا جان سمجھ کر ان سے فلرٹ کرنے لگی۔ کسی زمانے میں نانا جان اس پر بہت مہربان رہ چکے تھے۔ بڑھیا نامراد کی مت ماری گئی تھی۔ نانا جان کو مرے بیس برس ہو چکے تھے۔ اور وہ اپنی چیپڑ بھری آنکھوں میں پرانے خواب جگانے پر مصر تھی' بڑی لے دے کے بعد وہ ماموں کا اصلی مقام سمجھی تو مرحومہ ممانی کا ماتم لے بیٹھے۔

"ہئے ہئے۔ کیا بڑھاپے میں دغا دے گئیں"۔ اچانک اس کی نظر ممانی پر جا پڑی۔ ممانی صحن میں کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ عجب پیارے انداز میں وہ گردن نیوڑہائے بیٹھی تھیں' جیسے تصویر کھنچوا رہی ہوں۔ کبوتر ان کی بلوریں دکتی ہوئی ہتھیلی کو گدگدا رہے تھے۔ اور وہ بے اختیار ہنس رہی تھیں۔

"ہائے میں مر گئی!" بڑھیا نے اپنا چپاتی جیسا سینہ کوٹ کر رخسانہ ممانی کی طرف ہوا میں بلائیں لے کر کنپٹیوں پر دسوں انگلیاں چٹ چٹ چٹخائیں "اللہ پاک نظر بد سے بچائے۔ بیٹا تو چاند کا ٹکڑا ہے! میں جانوں میٹھا برس لگا ہے۔ اے میاں' وہ رازداری کے انداز میں ماموں کے قریب کھسکی۔ "سوداگروں کا منجھلا بیٹا ولایت پاس کر کے آیا ہے۔ اللہ قسم بس چاند اور سورج کی جوڑی رہے گی۔

کسی زمانے میں بڑھیا بڑے معرکے کی مشاطہ تھی' اب اس کا بازار بند ہو چکا تھا۔ چونڈا سفید ہوا' ہاتھ پیر سے معذور ہوئی تو ٹکڑے مانگ کر گزر اوقات کرنے

لگی تھی۔

تھوڑی دیر تک تو کسی کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ بڑھیا مردار کیا بک رہی ہے۔ سوداگروں کا منجھلا بیٹا جو ولایت پاس تھا سب کی نگاہوں میں تھا۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہوا کہ ناشدنی قطامہ رخسانہ ممانی کا رشتہ لگانے کی تاک میں ہے۔

"امام حسین کی قسم' میاں میں تو کنگنوں کی جوڑی لوں گی۔ بات چھیڑوں؟"

بات جو واضح ہوئی اور پانی مرا تو بھڑوں کا چھتہ چھڑ گیا۔ چاروں طرف سے توپیں دغنے لگیں۔

"ہئے ہئے مجھ جنم پٹی کو کیا خبر؟" بڑھیا سلیپر پہنتی رپٹی باہر کی طرف چلتے چلتے اس نے ماموں کی پٹی ہوئی صورت پر ایک مشتبہ نظر ڈالی "منہ پر تو صاف کنوار پنا برس رہا ہے"۔

اس دن شجاعت ماموں نے قرآن اٹھا کر سب کے سامنے کہہ دیا کہ یہ دونوں بچے ان کے نہیں' اڑوس پڑوس کی مہربانیوں کا پھل ہیں جن سے رخسانہ بیگم تاک جھانک کیا کرتی ہیں۔

اس رات وہ روتے رہے' کراہتے رہے' انگاروں پر لوٹتے رہے اس رات انہیں بڑی ممانی بہت یاد آئیں' ان کے بال قبل از وقت پک گئے تھے' ان کی جوانی' ان کا دلہناپا آنسوؤں میں بہہ گیا۔ میں اور پارسائی کا مجسمہ' وفا کی پتلی---- ان کے حصے کا بڑھاپا بھی انہوں نے اپنے وجود میں سمیٹ لیا' اور شریف بیویوں کی طرح جنت کو سدھاریں آج وہ ہوتیں تو یہ درد' یہ سوزش یہ سفید جڑوں والے مہندی لگے بال یہ رستے ناسور' یہ تنہائی بٹ جاتی۔ پھر بڑھاپا یوں نہ دہلاتا۔ دونوں ساتھ بڈھے ہوتے' ایک دوسرے کے دکھ کو سمجھتے' سہارا دیتے۔

امر بیل دن دونی رات چوگنی پھیلتی گئی۔ بڑ کے پیڑ کا تنا کھوکھلا ہو گیا' ٹہنیاں جھول گئیں' پتے جھڑ گئے..... بیل پاس کے دوسرے ہرے بھرے پیڑ پر رینگ گئی۔

کیسا جاں سوز سماں تھا! شجاعت ماموں کی میت صحن میں بنی سنوری رکھی ہوئی تھی' بہنیں کھڑی بڑی پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ماموں نے اپنی ساری جائیداد

بہنوں کے نام ہبہ کر دی تھی۔
رخسانہ ممانی سب سے الگ تھلگ در سے لگی بیٹھی تھیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنی حسین اور سوگوار بیوہ زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ سفید کپڑوں میں وہ عجیب پراسرار خواب لگ رہی تھیں۔ رو رو کر آنکھیں مخمور اور بوجھل ہو رہی تھیں۔ زرد چہرہ پکھراج کے نگینے کی طرح دمک رہا تھا۔ پرسے کو آنے والے سب کچھ بھول کر بس انہیں تکتے رہ جاتے۔ انہیں مرحوم کی خوش نصیبی پر رشک آ رہا تھا۔

ممانی پر بے پناہ بے بسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ خوف اور سراسیمگی سے ان کا چہرہ اور بھی بھولا لگ رہا تھا۔ دونوں بچے ان کے پہلو سے لگے بیٹھے تھے۔ وہ ان کی بڑی بہن لگ رہی تھیں۔
وہ گم صم بیٹھی تھیں، جیسے قدرت کے سب سے مشاق فنکار نے اپنے بے مثل قلم سے کوئی شاہکار بنا کر سجا دیا ہو۔
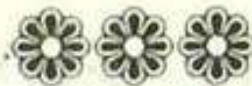
محبوب

محبوب!---- میری مراد فلم ڈائرکٹر محبوب سے نہیں' جنہوں نے مدر انڈیا بنائی تھی' اور نہ اس محبوب کا ذکر ہے جس کی تعریفوں میں شاعر اور ادیب زمین آسمان کے قلابے ملایا کرتے ہیں' جس کے فراق میں عاشقوں کی سٹی گم رہتی ہے' جس کی زلفوں میں گھٹائیں الجھی ہوتی ہیں' چہرے پر چاند جھلملاتا ہے' ہونٹوں پر گلاب کی پنکھڑیاں اور آنکھوں میں عاشقوں کے دلوں کو تاک کر گرنے والی بجلیاں بھری ہوتی ہیں- میں تو فقط اپنے باورچی طول عمرہ کا ذکر کر رہی ہوں- ان کی زلفوں پر گھٹاؤں کا شبہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وہ جمعہ کے جمعہ چاند گھٹاتے تھے آنکھوں میں بجلیاں نہیں کوند سکتیں کیوں کہ ان کی آنکھیں نہیں' صرف ایک اکلوتی آنکھ تھی- اس مرحوم آنکھ سے بھی کوئی رومانی داستان وابستہ نہیں' کیوں کہ چیچک میں بیٹھ گئی تھی' اور بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی-

نہ جانے ماں باپ نے خوگیر کی بھرتی میں سے صرف ان کا نام محبوب رکھنے میں کیا مصلحت سمجھی- محبوب کسی زمانے میں بھی کسی کو محبوب نہ رہے- وہ تو صرف چھ بچوں کے باپ اور ایک عدد مدقوق بیوی کے شوہر تھے- اس کے علاوہ بہت سے بدحواس قسم کے آقاؤں کے باورچی بھی رہ چکے تھے- ہانڈیاں پکانے اور پوریاں کچوریاں تلنے کی بجائے وہ قسمت کے مارے آقاؤں کو زیادہ خوش اسلوبی سے تل دیتے تھے- دنیا میں جہاں اور چیزیں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوتی جا رہی ہیں' اسی طرح باورچیوں کا بھی کال پڑتا جا رہا ہے- محبوب ہر پیشہ اختیار کرنے کے بعد اسے اپنے وجود کے لئے قاتل پا کر باورچی گیری پر آ کر ٹکے- اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ اس فن میں ماہر تھے- جہاں تک مہارت کا تعلق ہے' وہ گورکن بھی ہو سکتے ہیں-

محبوب کھانا پکانے کے معاملے میں بالکل ایک من موجی فن کار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کا فن نہایت جدید اور کچھ تجریدی آرٹ کے اسکول سے تعلق رکھتا تھا۔ جیسے جدید پینٹنگ کو دیکھ کر آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ عورتیں کھڑی ہیں یا گنے کا کھیت ہے' بالکل اسی طرح محبوب کے پکائے ہوئے کھانوں کو چکھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قورمہ ہے' قلیہ ہے یا کھڑے مسالے کا گوشت ہے۔ جہاں تک مسالوں کا تعلق ہے وہ کھرے بیٹھے مسالے کا سالن پکانے کی بجائے کچھ اچھلتے کودتے اور اودھم مچائے مسالوں کے کھانے پکاتے تھے۔ سیاسی پارٹیوں کی طرح ہر مسالہ بالکل اکیلا اور اچھوتا اپنا رنگ ڈھنگ اور زور دکھاتا نظر آتا لہسن پیاز' ہلدی' دھنیہ سب جدا جدا سر الاپتے۔ مجال ہے جو ایک مسالہ بھی اپنی منفرد بو' بساند یا بجھلاندیر دوسرے کے خواص حاوی ہونے دے۔ صرف اتنا فرق ہو جاتا کہ اس ظاہری سمجھوتے کی اندرونی پھوٹ اور نااتفاقی کی وجہ سے ہر بدبو زیادہ سے زیادہ ناگوار ہو کر بھرنے لگتی اور کھگانے والا اس نفاق بھری ہانڈی کے نوالے کو سانپ کے منہ کی چھچھوندر کی طرح اپنے جبڑوں میں دبا کر گم صم رہ جاتا۔

محبوب کو بندھے ٹکے سماجی اصولوں اور ضابطوں سے للہی بغض تھا۔ اس لئے وہ کبھی موسم کی تازہ ترکاری نہیں لاتے تھے----- ڈھونڈ ڈھونڈ کے بے موسم کی نایاب ترکاریاں لاتے۔ اگر مٹر کا موسم ہوتا تو وہ سیموں کی تلاش میں سر گاڑی پیر پہیہ کر دیتے۔ شلجم کے زمانے میں گوبھی کے لئے سرگرداں رہتے۔ پالک کے موسم میں خرفہ تلاش کر کے لاتے اور اگر بہت سی ترکاریوں کا موسم ہو تو وہ مجبور ہو کر دال گوشت پکا لیتے۔

گھر کی ساس کی محبوب سے جنم جنم کی پرخاش تھی۔ شاید صدیوں سے ان کے ساتھ پیدا ہو کر وہ ہانڈیوں کے بہانے ان کا جی جلاتے بھونتے اور بھلستے چلے آ رہے تھے۔ بے چاری نے کسی جنم میں کوئی نہایت ڈراؤنا پاپ کیا ہو گا' جس کی سزا میں محبوب ان پر عذاب الٰہی بن کر نازل ہوئے اور شاید رہتی دنیا تک یوں ہی نازل

ہوتے رہیں گے۔ اگر اگلے جنم میں انہوں نے بکری کا روپ دھارا تو محبوب قصائی کی چھری کی صورت میں پیدا ہو کر ان کے گلے پر پھر جائیں گے۔

مگر وہ جنتی بی بی کی طرح صبر و شکر کے ساتھ محبوب کو جھیلا کرتیں قسمت کا لکھا سب کو بھگتنا پڑتا ہے۔ انسان کی مجال نہیں جو سزا اور جزا سے بچ جائے وہی مثل تھی "اسے ٹھور نہیں انہیں اور۔" باورچیوں کی قلت نے محبوب کو رزق کا مالک بنا دیا تھا۔ کئی بار ان سے بچنے کی کوشش کی گئی۔ دوسرا باورچی آیا، مگر جلد ہی بھاگ گیا اور رکشا کھینچنے لگا۔ یا کسی فیکٹری میں گم ہو گیا۔ محبوب رکشا کھینچنے میں خود اتنے زیادہ کھنچ جاتے کہ بس! ماشاء اللہ بھلی۔ بیبیاں جب رکشا میں بیٹھتی تھیں تو ان کے وزن کی کھنچائی کے لئے دو خچروں کے دم والا پہلوان بھی گھٹنے ٹیک دیتا۔ یہ کام ٹڈوں اور بھنبھیریوں کے قبیلے کے انسان کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ جب وقتاً" فوقتاً" ایک ایک کر کے شہر کی تمام شریف بیویوں کو وہ نالے میں گرا چکے تو رائے عامہ ان کی رکشا بازی کے خلاف ایک زبردست محاذ بنا کر کھڑی ہو گئی۔ تب قائل ہونا پڑا کہ ڈارون تو نرا خبطی تھا۔ اور انسان بندر کے علاوہ بھنگوں اور پتنگوں کی نسل سے ترقی (یا تنزل؟) کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔

لہٰذا تمام رکشائیں اوندھانے کے بعد وہ پھر باورچی کے پیشے کی طرف لوٹ آئے۔ جب کبھی انہوں نے کسی اور پیشے پر دست شفقت پھیرنا چاہا تو کوئی نہ کوئی قیامت آ گئی۔ انہوں نے پھلوں کی چھابڑی لگائی تو ہیضہ، جو شاید تاک میں بیٹھا تھا، شہر پر ٹوٹ پڑا اور میونسپلٹی والے محبوب پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے ملائی کے برف کا بیوپار شروع کیا تو فوراً کالی کھانسی اور پیچش کی وباء شہر میں پھیل گئی۔ لوگ ان کی قلفیوں کو دیکھ کر ایسے بدکنے لگے جیسے وہ لذیذ قلفیاں نہیں یم دوت کی بندوق سے نکلی ہوئی گولیاں ہوں۔ انہوں نے خربوزوں کی فالیز کا ٹھیکہ لیا تو اولے پڑ گئے۔ سنگھاڑے کی تال پر آس لگائی تو جونکوں کی وبا نے پڑا کر دیا۔ جو سنگھاڑے وہ بیچتے ان میں سنگھاڑے کم اور جونکیں زیادہ تول دیتے۔ جب کوئی دھندا بیٹھ جاتا تو وہ ستانے کے لئے پھر باورچی گیری پر لوٹ آتے۔ اتفاق سے ان کا جب بھی دیوالہ

نکلتا' اللہ ان کا غم غلط کرنے کے لئے انہیں ایک عدد اولاد عطا فرما دیتا۔ مگر دیوالوں کی رفتار کا تو نہ ان کی بیوی مقابلہ کر سکتی تھیں نہ خدا کی قدرت۔ بچہ ان پر سال میں ایک ہی نازل ہو سکتا تھا' جب کہ دیوالہ خدا کے فضل و کرم سے سال میں چھ مرتبہ نکل جاتا تھا۔

محبوب کا وزن اسی اور بیاسی پونڈ کے آس پاس رہتا تھا۔ کبھی تولہ دو تولہ بڑھ جاتا تو کوئی عارضہ انہیں لاحق ہو جاتا اور وزن سیروں گھٹ جاتا بکری جیسی سوکھی ٹانگوں کے باوجود وہ ہمیشہ چست ٹخنوں پاجامہ اور فوجی قطع کی قمیض پہنتے' کیوں کہ انہیں ایک دفعہ ڈسپوزل سے فوجی قمیض مل گئی تھیں۔ اس کے بعد عید بقر عید پر نئی قمیضیں بھی انہوں نے اسی فیشن کی سلوائیں' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس قمیض سے ان کی شخصیت ضرورت سے زیادہ مرعوب کن ہو جاتی تھی۔ تنگ پاجامے کا راز گھر کی ساس نے ایک دن معلوم کر لیا۔ واضح رہے یہ پاجامہ اوپر سے بالکل ڈھیلا ہوتا' مگر پائنچے وہ اوپر سے سی کر چست کر لیتے۔ یوں ایک نہایت آرام دہ اسٹور روم تیار ہو جاتا۔ ساس کا خیال تھا کہ اناج' سبزی ترکاری سے لے کر گوشت کی بوٹیاں اور سردیوں کے دنوں میں مکھن اور گھی کی ڈلیاں تک اس میں بڑے اطمینان سے اسٹور کی جا سکتی ہیں۔ کھانے کے سامان اور جنس میں سے جو وہ کمیشن منہا کرتے وہ جمع ہوتا رہتا۔ اور دوپہر کے کھانے کے بعد اور رات کو تھیلیاں جھاڑ لی جاتیں۔

کھانے کے سامان میں سے تراش خراش کے جو نایاب نسخے انہیں یاد ہیں اگر وہ کتابی صورت میں جمع کیے جائیں تو ایک شاہکار تیار ہو جائے' جس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہو گا۔ گھر کی ساس کی سنسر پالیسی جب اتنی سخت نہ تھی تب تو محبوب نہایت غیر شاعرانہ طریقے سے آٹا' دال اور گھی چرا کر لے جاتے تھے۔ مگر جب سے ساس نے دال چاول کے دانے گن کر دینا شروع کر دیئے' محبوب نے بھی مدافعت کا ایک وسیع چارٹ تیار کر لیا۔ مثلاً جب ہر چیز تول کر دینے کے بعد بھی سالن کی صورت پر پھٹکار ہی برستی رہی تو ساس عین باورچی خانے کے سامنے دھرنا

دے کر بیٹھ گئیں۔ مگر جب کھانا نکل کر میز پر آیا تو سب کے پسینے چھوٹ گئے۔ محبوب ضرور کسی جن کو قابو میں کئے ہوئے تھے' ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آنکھوں کے سامنے گھی ڈالا جائے اور شوربے پر تار نہ نظر آئے۔

بڑے داؤں پیچ کے بعد آخر معمہ حل کر ہی لیا گیا۔ محبوب نے ایک چھوٹی سی پیالی کوئلے کی ٹھلیا میں چھپا دی تھی۔ چمچہ چلاتے چلاتے وہ نہایت لچک دار پینترے سے ہر بار تھوڑا سا گھی اس پیالی میں ٹپکا دیتے تھے---- بڑا صبر آزما کام تھا۔ مگر محبوب کی جدت کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ترکاری کا بھی انہوں نے انتظام کر لیا۔ چھیلتے وقت آلو کے موٹے سے موٹے چھلکے اتارتے۔ ذرا سا کترا ہوتا آدھا آلو کاٹ کر پھینک دیتے۔ چھلکوں میں دو دو مٹر چپکے چھوڑ دیتے بوٹیاں چونکہ بازار سے آتے ہی چیک کر کے گن لی جاتی تھیں' اس لئے وہ سموچی تو غائب نہ ہوتیں' ہاں ذرا اسکڑ کر چھوٹی ہو جاتیں جیسے انہیں گلہری نے ذرا ذرا سا کتر کر گول کر دیا ہو۔ گھر والی کوڑے کے ڈبے جھانکتی پھرتیں۔ بوٹیاں حسرت سے ٹٹولتیں۔ ان کی نقاہت پر ان کا خون خشک ہونے لگتا۔ ترکاری کے موٹے موٹے چھلکوں کے غم میں سوکھتی جاتیں۔ گھر جاتے وقت محبوب کوڑے کے ڈبے میں سے ترکاری کے چھلکے وغیرہ پوٹلی میں بھر کے لے جاتے۔

محبوب کی آنکھ چیچک میں کچھ اس پھوہڑپن سے بیٹھی تھی کہ اس میں شیشے کی آنکھ اٹکانا بہت مشکل تھا۔ کوئی آنکھ فٹ ہی نہیں بیٹھتی تھی۔ پہلے آنکھ کچھ ڈھیلی تھی' کہیں گر پڑی۔ کچھ دن یونہی آنکھ چھماتے گھومتے رہے' اس کے بعد جو عیدی کی بخشش جمع کر کے آنکھ لائے تو اتنی بڑی کہ پپوٹے تن گئے۔ باہر کو ابلی پڑتی تھی اور سوتے میں بھی سائیکلوپ کی آنکھ کی طرح کھلی رہتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ نیلے رنگ کی تھی جب کہ ان کی اصلی آنکھ پن چھٹی کیچڑ کے رنگ کی تھی۔

"جی سرکار بہت سستی مل گئی۔" اگر سستی مل گئی تو پھر تو اعتراض کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ گو اس آنکھ کو لگانے کے بعد وہ کافی سے زیادہ بھیانک لگنے لگے۔ لوگوں کے خیال میں وہ جادو کی آنکھ تھی' کیونکہ اسے لگانے کے بعد وہ بالکل

ہی قزاق بن کر لوٹنے لگے۔ گو وہ سراسر قسمیں کھاتے تھے کہ ایک چیز بھی چرائی ہو تو کفن کو لگے۔ ظاہر ہے ترکاریاں اور گھی کسی شریف آدمی کے کفن کو نہیں لگ سکتا۔ لہٰذا ان کی قسموں سے ان کی ایمان داری کو کوئی سہارا نہ ملا۔ ویسے خدا کی قسم پر لوگ اس زمانے میں بھروسہ بھی نہیں کرتے۔ اس لئے آپا انہیں بچوں کی قسمیں کھلاتیں۔

"منے کی قسم۔" وہ پھٹ سے منے کی قسم کھا جاتے۔

"واہ واہ منے کی قسم کھا رہا ہے، سرور کی قسم کھا۔" آپا چرکوں میں آنے والی آسامی نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ منا پیدائشی لنجا ہے پھلکی سا پیٹ، دستوں کا منبع ڈیڑھ آدمی کی خوراک پھونک دیتا ہے۔ مرنے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتا، خواہ کتنی بھی جھوٹی کوئی قسمیں کھا لے، وہ ڈٹا رہے گا۔ ڈاکٹروں نے جو علاج بتائے وہ اگر محبوب کی سات پشتیں بھی زندہ ہو کر زور لگائیں تو نہیں ہو سکتا۔ سب کو معلوم ہے وہ کبھی اٹھ کر نہیں بھاگے گا، کبھی کوئی کام نہ کر سکے گا۔ اس کی زندگی ایک بے معنی نقطہ ہے جس کے آگے پیچھے کوئی پر معنی جملہ نہیں۔ اور محبوب بڑی فراخ دلی سے اس کی جھوٹی قسمیں کھا سکتا تھا۔

مگر سرور جو نویں جماعت میں پڑھتا تھا جس کے انگریزی فیشن کے بال تھے اور نیکر پہنتا تھا، خاندان میں ولی عہد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی بچی قسم بھی دلاؤ تو محبوب کی اکلوتی آنکھ میں خون اتر آتا۔ پھر اس کی گونگی آنکھ بھی سسکیاں بھرنے لگتی۔ اور وہ نوکری چھوڑنے پر تیار ہو جاتا۔ سرور ہی کی خاطر وہ چوڑی دار لکھنوا پاجامہ پہنتا اور کوئلے کی مٹکی میں گھی کی کٹوری چھپاتا۔

ایک آنکھ سے محروم ہونے کے علاوہ محبوب کچھ اونچا بھی سنتے تھے ایک دن باہر سے آکر میں نے پوچھا "محبوب! ڈاکٹر گھوش آئے تھے؟"

"جی ہاں سرکار!" انہوں نے دال بگھارتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"جی سرکار! روی!"

"کیا؟"

"جی ہاں تل کر ڈالی ہے۔"

"اے کم بخت کیا بک رہا ہے؟ میں پوچھ رہی ہوں ڈاکٹر گھوش کو، اور تو اروِیاں تل رہا ہے۔"

"ارے سرکار، میں سمجھا گوشت کو پوچھ رہی ہیں۔"

مگر میری آپا کہتی تھیں، وہ بنتا ہے۔ وہ تو اس کے کانے پن کو بھی بناوٹ کہہ دیتیں۔ اگر اس کی نیلی آنکھ ایک مرتبہ باورچی خانے کی نالی میں پڑی نہ ملتی۔ اس دن سے آپا نے اس نیلی آنکھ کے خلاف محاذ قائم کر دیا یہ آنکھ یقیناً کسی کانے انگریز کے لئے بنی ہو گی۔ اس لئے ان کا خیال تھا کہ اس کو لگانے کے بعد محبوب بالکل برٹش شاہی زمانے کا لاٹ صاحب بن جاتا، اور باورچی خانے کو نو آبادیات کی طرح لوٹنے لگتا۔ روٹیاں قحط زدہ مخلوق کی طرح وہاں پان ہونے لگتیں، بوٹیوں کو سوکھے کا آزار ہو جاتا اور شوربے کا حال پتلا پڑ جاتا۔ یہی نہیں وہ برٹش پالیسی کو مکمل طور پر کامیاب بنانے کے لئے ساس بہو میں پھوٹ ڈلوا کر اپنی چاندی بھی کر لیتا۔

"بڑی بیگم صاحب، گوشت میں کیا پڑے گا؟ وہ ساس سے پوچھتا۔"

"میتھی پالک ----- اور ہاں ہری مرچیں، بیچ میں سے چیر کے ڈالنا ہمیشہ کی طرح بند نہ ڈال دینا موئی نروٹھا سی ہو جاتی ہیں -----" ساس جواب دیتیں۔

پھر وہ احتیاطاً" بہو سے پوچھتا۔ "دلہن بی گوشت میں کیا پڑے گا؟"

"ٹماٹر ----- اور دیکھو ہری مرچیں نہ جھونک دینا۔ صاحب کو نفرت ہے۔" بہو حکم دیتیں۔

وہ ساس بہو کی مختلف پسند کے چکر میں پڑ کر کدو گوشت پکا کر اس میں کھڑی مرچیں ڈال لیتا۔ ظاہر ہے کہ کدو دیکھ کر پورا گھر ید کنے لگتا۔ محبوب کی پکار پڑتی اور وہ قطعی بت کافر بنا ہوا حاضر ہوتا۔

"کیوں رے کم بخت پالک میتھی کے بجائے یہ اپنا سر ڈال دیا گوشت میں!" ساس چلاتیں۔

"سرکار دلہن بی نے کہا تھا ٹماٹر ڈالیو۔۔۔۔"

"تو پھر ٹماٹر کیوں نہیں ڈالے؟" بہو پوچھتی۔

"حضور بڑی بیگم نے کہا تھا پالک میتھی پڑے گا۔"

"تو پالک میتھی کیوں نہیں ڈالا مردے۔" ساس پوچھتیں۔

"اب سرکار میری تو بڑی مصیبت ہے۔ میتھی پالک ڈالتا تو بہو بیگم چیختیں اور ٹماٹر ڈالتا تو بڑی بیگم چلاتیں۔ آپ ہی بتایئے کس کا حکم مانوں اور کس کا نہ مانوں۔" وہ چڑ کر جواب دیتا۔

"اس لئے تم نے کدو ڈال دیا۔" صاحب سے ضبط نہ ہو سکا۔

"جی سرکار اور کیا کرتا۔ ویسے کدو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ دماغ کو تراوٹ پہنچاتا ہے۔"

تب سارا گھر کدو کی طرح سرد پڑ جاتا۔ محبوب کو معلوم تھا کدو کوئی نہیں کھائے گا۔ وہ نہایت اطمینان سے بھرا کٹورا سالن گھر لے جاتا۔

اس وقت بے اختیار سب کے منہ سے نکل جاتا:

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ

میں چھٹیوں میں گئی تو گھر میں ایک قیامت مچی ہوئی تھی۔ چھوٹی باجی اپنے ساتھ لکھنؤ سے کوئی چودہ پندرہ برس کی لونڈیا لے آئی تھیں۔ عجب پٹاخہ تھی لونڈیا۔ دن بھر ہلو ہلو کرتی پھرتی۔ نہ جانے کیا جوڑ توڑ کئے مردار نے کہ پیر بھاری ہو گیا۔ چھوٹی باجی تو بچھو کا ڈنک چھوڑ سسرال بھاگیں اور لوگوں کی سٹیاں گم ہو گئیں۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کیا کیا جائے ایک دن شام کو گھر لوٹی تو محبوب نے چائے کی ٹرے سامنے رکھ دی پھر نہایت شرماتے مسکراتے ہوئے انداز میں تیل کی بساندی جلیبیوں کی پلیٹ سرکا دی۔۔۔۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جب بھی محبوب کی بیوی آبادی میں اضافہ کرتی مجھ خفقان ہونے لگا۔

"لڑکا کہ لڑکی؟" میں نے کلس کر پوچھا۔

محبوبؔ چھوئی موئی کی طرح ڈھلک گئے۔

"اے ہے بولتا کیوں نہیں؟ چپڑ قناتی۔"

"میں نے ظہورن سے نکاح پڑھوا لیا۔"

"ایں؟" میں ایسے اچھلی کہ چائے کی پیالی کھڑکھڑا کے رہ گئی۔

"تو کیا کرتا سرکار؟" محبوب نے دانت نکوسے اور میرے لیکچر کو احمق کی بڑ سمجھ کر ٹال گئے---- ایک دق کی ماری منحوس بیوی تو سنبھالی نہیں جاتی مردے سے۔ ایک اور کر لی اور وہ بھی بھری نال کی بندوق سے۔ یا خدا اب یہ ڈبل رفتار سے دھرتی کا بوجھ بڑھانے پر تل جائے گا۔ رحم کر خدایا۔

کئی سال میرا جانا ادھر نہ ہو سکا۔ یونہی اڑتی ہوئی خبر سنی کہ محبوب کی پہلی بیوی مر گئی۔ بچے مسجد کے سامنے بھیک مانگتے ہیں۔ سرور بمبئی بھاگ گیا۔ پھر سنا کہ محبوب بھی بمبئی آ گئے ہیں۔ کسی فلم کے دفتر میں چپراسی ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک دن فیمس میں ملے۔ کہنے لگے "گھاٹ کوپر میں ایک کھولی مل گئی ہے سرور آوارہ نکل گیا ہے۔ منا ماں کے ساتھ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ظہورن حرافہ کسی کرم کی نہیں۔" وہی چست پاجامہ پہنے ہوئے تھے ملٹری نما قمیض پر بھوری گاندھی کیپ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

دو سال بعد ملے تو ایک دوسری چھوٹی سی کمپنی میں کچھ پروڈکشن منیجر کے عہدے پر معمور نظر آئے۔ انداز بھی بدلے ہوئے تھے۔ دو سال پہلے چنی بی بی کہتے تھے اب آپا جی کہنے لگے۔

ابھی پچھلی اتوار کو محبوب پھر مل گئے میں تو پہچان بھی نہ سکی۔ چست پاجامہ تو وہی تھا مگر اس پر نہایت نحل اچکن ڈاٹے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پانچ سو پچپن کا ڈبہ تھا۔ آنکھ کے بے تکے پن کو کالا چشمہ ڈھکے ہوئے تھا۔

"بے بی کو کام مل گیا ہے" انہوں نے کھیسیں نکال کر پاس کڑھی ہوئی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔ اور میری عقل قلابازی کھا گئی۔ وہ بھی ذرا دیر کو ایسے بوکھلا گئے جیسے میں نے انہیں نیفے میں گوشت کی بوٹی چھپاتے پکڑ لیا ہو۔

"ظہورن!" میرے ذہن میں چھلاوہ کی شکل کوند گئی۔

محبوب میاں سنبھل کر بولے "نمستے کرو آپا جی کو موہنی بالا"

وہ سوکھی سی ظہورن!

ان دنوں موہنی بالا ہماری فلم میں سائڈ ہیروئن کا کام کر رہی ہے۔ عام فلمی ہیروئن کی طرح اس پر چربی کی تہیں چڑھ گئی ہیں۔ شام کو یہ لمبی موٹر میں جین اور بش شرٹ پہنے، کالا چشمہ لگائے نکلتی ہے تو لوگ موٹر کے سامنے آ آجاتے ہیں۔ محبوب میاں کو وہ انکل کہتی ہے۔

اور جب محبوب میاں بے بی کے سیٹ پر آجاتے ہیں تو سارا عملہ سروقد کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر ان کے جاتے ہی لوگ پھٹ پڑتے ہیں بڑا بدمعاش ہے۔تین چوتھائی بلیک لیتا ہے۔ اٹھ بیٹھک الگ کرواتا ہے۔" پروڈیوسر کہتے ہیں۔

بچے شان دار اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ سرور موٹا دنبہ ہو گیا ہے۔ موٹر دوڑاتا پھرتا ہے اور ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ گلچھرے اڑاتا ہے۔ دو فلیٹ باندرہ میں ہیں۔ ایک پیڈر روڈ پر۔ تھانے کے پاس زمین لے کر فلم اسٹوڈیو بنانے کا ارادہ ہے۔

مگر میں جب بے بی کا بلیک کا روپیہ انہیں چوری چھپے رکھتے دیکھتی ہوں تو بے اختیار نگاہیں ان کے چست پاجامے پر جم جاتی ہیں۔

یقیناً اب وہاں آٹے دال اور ترکاری کے چھلکوں کے بجائے کڑکڑاتے نوٹ بھرے ہوں گے!

عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پر پیچ اور دشوار گزار
نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو
عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے
ظاہر میں ہے' اس کے باطن میں ہے۔

(کرشن چندر)

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض
ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں'
کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی
کو حاصل ہے' اس کا منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہو گا۔

(پطرس بخاری)

RHOTAS BOOKS
Ahmed Chambers 5 Temple Road Lahore

Rs. 45/=